اردو نثر

BAUL-101

(پہلا پرچہ) برائے بی –اے سال اول

Block- 1 to 4 (بلاک ۱ تا ۴)

Unit- 1 to 13 (اکائی ۱ تا ۱۳)

SCHOOL OF LANGUAGES
UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY, HALDWANI
(NAINITAL) -263139
اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی ' ہلدوانی (نینی تال)

سرپرست اعلیٰ:

پروفیسر سبھاش دھولیا، وائس چانسلر، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی

کمیٹی بورڈ آف اسٹڈیز:

پروفیسر ایچ۔ پی شکلا (ڈائرکٹر، اسکول آف لینگویجز UOU)
پروفیسر سید محمد ہاشم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
پروفیسر سید محمد نعمان، این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، دہلی۔
ڈاکٹر اختر علی، اکیڈمک ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر گرجا پانڈے، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈینیٹر وایڈیٹر:

ڈاکٹر اختر علی

اکیڈمک ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

c جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت: جولائی 2013

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی کے درس نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات یا کسی بھی وضاحت کے لیے یونیورسٹی حکام یا کورس کوآرڈینیٹر سے یونیورسٹی کے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

Course Coordinator (urdu)

Uttarakhand Open University,Haldwani-263139(Nainital)

Phone: 05946-261122, 261123 Tool free No. 1800 180 4025

Fax: 05946-264232, E-mail: info@ uou.ac.in,http://uou.ac.in

پیش لفظ

اتراکھنڈاوپن یونیورسٹی کا قیام اتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت 31 اکتوبر 2005 کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ذریعے ان لوگوں تک تعلیم کو پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب ازخود کالجوں اور یونیورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی جن تعلیمی پروگراموں کی شروعات کی ہے ان میں سے ایک بیچلر آف آرٹ بھی شامل ہے۔ ''اردو ادب'' اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ یہ کتاب بی ۔اے سال اول (پہلا پرچہ) کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ چار بلاکوں اور تیرہ اکائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ اکائیاں دراصل الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقہ تعلیم کی کتابوں کو خود تدریسی مواد [Self Instructional Material(SIM)] کہا جاتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ طالب علم کو اس مواد کو خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اسے پڑھانے کے لیے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا۔ آپ اس مواد کو خود ہی پڑھیں گے اور خود ہی سمجھیں گے۔ اس صورتحال کے تحت اسباق کو اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجود ہونے کا احساس ہو سکے اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی بہت حد تک دور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مربوط و مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان میں ''اپنے مطالعے کی جانچ کے سوالات'' بھی دیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ بھی پڑھا ہے اسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے' اس کا اندازہ لگا سکیں۔ ان سوالات کے جوابات آخر میں دیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود ہی جواب دیں اور جب جواب مکمل ہو جائے تب آخر میں دیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملا لیں۔ اس سے آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگا اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہوگی۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اس کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ اکائیوں کے آخری حصے میں بعض کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ آپ ان کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

ہم آپ کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

فہرست

بلاک نمبر ۱۔ اردو کی کہانی

اکائی ۱۔ اردو زبان وادب کا ابتدائی زمانہ	جناب نعیم انیس
اکائی ۲۔ اردو ادب کا سنہرا دور	جناب نعیم انیس
اکائی ۳۔ اردو ادب کا عہد جدید	ڈاکٹر اختر علی

بلاک نمبر ۲۔ اردو قواعد

اکائی ۴۔ جملے کی بناوٹ	پروفیسر شارب ردولوی
اکائی ۵۔ موئنث مذکر، واحد جمع، متضاد، مترادف	پروفیسر شارب ردولوی
اکائی ۶۔ محاورے اور کہاوت	پروفیسر شارب ردولوی
اکائی ۷۔ اردو کی شعری اصطلاحات	پروفیسر شارب ردولوی

بلاک نمبر ۳۔ انشائیہ

اکائی ۸۔ انشائیہ کی تعریف	ڈاکٹر خالد محمود
اکائی ۹۔ محمد حسین آزاد: سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	ڈاکٹر آمنہ تحسین
اکائی ۱۰۔ عبدالحلیم شرر: دیہات کی زندگی	ڈاکٹر انور پاشا

بلاک نمبر ۴۔ مضمون

اکائی ۱۱۔ سرسید احمد خاں: عورتوں کے حقوق	ڈاکٹر رضی الرحمٰن
اکائی ۱۲۔ شبلی نعمانی: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر	ڈاکٹر سراج اجملی
اکائی ۱۳۔ عبدالحق: حالی	ڈاکٹر رضی الرحمٰن

بلاک نمبر 1

اُردو کی کہانی

اکائی 1. اُردو زبان وادب کا ابتدائی زمانہ

اکائی 2. اُردو ادب کا سنہرا دور

اکائی 3. اُردو ادب کا عہد جدید

یہ بلاک درج بالا تین اکائیوں پر مشتمل ہے اور جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے اس پورے بلاک میں اُردو کے آغاز سے لے کر آج تک کے سفر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اُردو کے آغاز اور اس کے ارتقائی سفر کو آپ کے سامنے کہانی کے انداز میں پیش کیا جائے تا کہ آپ اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ آپ کی سہولت کی خاطر ایک بڑے عنوان یعنی ''اُردو کی کہانی'' کو تین اکائیوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ انہیں الگ الگ تو ضرور پڑھیں لیکن کم از کم دو یا تین بار ان تینوں اکائیوں کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کا باہمی ربط اُردو کی کہانی سمجھنے میں آپ کے لیے انتہائی مددگار ثابت ہوگا۔

اُردو کی مختصر کہانی تو یہ ہے کہ اس زبان کی ابتدا اب سے تقریباً ایک ہزار سال قبل مختلف تہذیبی ولسانی پس منظر رکھنے والوں کے آپسی میل جول کے نتیجے میں شمالی ہندوستان کے شہر دہلی اور اس کے اطراف میں ہوئی۔ اُردو ادب کے ابتدائی نقوش جنوبی ہندوستان میں ملتے ہیں اور وہیں اُردو ادب کی اہم شعری ونثری کتابیں تحریر کی گئیں۔ بعد میں دہلی اور لکھنؤ اس زبان وادب کے اہم مراکز قرار پائے۔ یہ زبان اپنی شیرینی، نزاکت اور مختلف لسانی خصوصیات کے سبب آج بھی زندہ جاوید ہے اور اس کا ادب نہ صرف ہندو پاک میں بلکہ پوری دنیا میں فروغ پا رہا ہے۔

آیئے اب ہم اِن تمام پہلوؤں کا وضاحت کے ساتھ اور مفصل انداز میں مطالعہ کریں!

اکائی 1: اُردو زبان وادب کا ابتدائی زمانہ

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 اردو زبان کا آغاز

1.4 اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

1.5 اردو زبان کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریات

1.6 اردو ادب کا ابتدائی زمانہ

1.6.1 اردو ادب دکن میں

1.6.2 اردو ادب شمالی ہند میں

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 معاون کتابیں

1.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1.1 اغراض ومقاصد

ہماری اردو زبان کا جنم سرزمین ہند میں ہوا اور یہیں پر یہ پلی بڑھی اور پھولی پھلی۔ اس کی تشکیل میں بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک نے حصہ لیا۔ ایک طرف صوفیائے کرام نے اسے اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا تو شعرا و ادبا نے اپنی تخلیقات سے اس زبان کے ادب کو مالا مال کیا۔ اردو زبان کا آغاز وارتقا اور اس کے ابتدائی ادب سے آپ کو واقف کرانے کے لیے یہ اکائی نصاب میں شامل کی گئی ہے۔ اس اکائی میں اردو زبان وادب کے ابتدائی زمانے پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور یہ بتایا جائے گا کہ زبان اردو نے اپنے ابتدائی دور میں کن کن صورتوں کا سامنا کیا اور

کس طرح سے ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی آج نکھر کر ایک ایسی زبان بن گئی ہے جو گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اُردو کی پیدائش کے تعلق سے پائے جانے والے مختلف نظریات، اس کے فروغ میں صوفیائے کرام کا حصہ نیز دکن اور شمال میں اس زبان کے ادب کا ابتدائی حال بھی بیان کریں گے جس کے مطالعہ سے آپ یہ جان جائیں گے کہ اردو زبان و ادب نے اپنے ابتدائی زمانے میں دکن اور شمالی ہند میں کس طرح ترقی کی راہیں ہموار کیں۔

1.2 تمہید

زبانوں کے ارتقا سے متعلق نظریات کا مطالعہ فکر انگریز بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ چونکہ زبانوں کی نشو ونما انتہائی فطری طور پر ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کسی بھی شعوری کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے نشو ونما اور ارتقا کی وجوہات' اسباب اور عوامل کی دریافت کا عمل انتہائی مشکل بھی ہوتا ہے اور محنت طلب بھی۔ پھر جن اسباب اور وجوہات کو ہم کسی زبان کے آغاز و ارتقا کے تعلق سے اہم سمجھتے ہیں ان کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی نہیں ہوتی ہے اور سارا معاملہ قیاس پر ہی منحصر ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہوتا کہ ہم زبان کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے اسباب کی تلاش کا کام بند کر دیں کیونکہ لسانیات کا علم زبان کی ابتدائی صورت حال کا اندازہ کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے اور اس طرح زبان کی ابتدا اور ارتقا کے تعلق سے کوئی نظریہ ضرور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کے آغاز اور اس کے ارتقا کے تعلق سے مختلف نظریات سامنے آئے ہیں۔ ان تمام نظریات میں ایک بات مشترک ہے کہ اردو کا آغاز مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہوا۔

1.3 اردو زبان کا آغاز

اردو زبان کی ابتدا تقریباً ایک ہزار عیسوی کے آس پاس شمالی ہندوستان میں ہوئی۔ جب ہم کسی بھی زبان کی ابتدا کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زبانیں ایک یا دو دن میں وجود میں نہیں آتیں اور نہ ہی وجود میں

آنے کے بعد فوراً اپنی حیثیت منوالیتی ہیں بلکہ اس کے لیے ایک لمبے عرصے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ جب مختلف زبانوں کے بولنے والے یک جا ہوتے ہیں تو ان کے آپسی تعلقات، لین دین، تجارت اور سماجی سرگرمیوں، تہذیب وثقافت کے مظاہروں اور بول چال سے رفتہ رفتہ ایک نئی زبان پیدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ہماری اردو زبان کے ساتھ ہوا۔ ہمارے ملک ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا جاتا ہے۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ زبانیں دراصل تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہوا کرتی ہیں۔ اردو زبان کے لئے بھی سرزمینِ ہند کی مٹی بڑی سازگار ثابت ہوئی۔ جب ابتدا میں مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں اپنے ساتھ لائے۔ یہاں انھوں نے اہلِ ہند کے ساتھ اپنے تعلقات تاجرانہ حیثیت سے، سماجی حیثیت سے، ثقافتی حیثیت سے اور روزمرہ کے معاملات حل کرنے کے لئے استوار کیے۔ ان میں عرب، ایرانی، افغانی، ترک اور مغل شامل تھے جو اپنے ساتھ اپنی زبان کے علاوہ اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی قدریں بھی ساتھ لائے تھے۔ جب ان میں اور ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے درمیان تعلقات کی راہیں مزید ہموار ہوئیں تو انھوں نے اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے کچھ اپنے الفاظ اور کچھ مقامی بولیوں کا سہارا لیا۔ اس طرح ایک نئی زبان کا وجود عمل میں آیا۔ آج ہم جس روانی کے ساتھ اپنی زبان اردو کا استعمال کرتے ہیں وہ زمانے کے نشیب وفراز اور مختلف مراحل سے گذر کر اس مقام پر پہنچی ہے کہ ہم نہایت آسانی کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کریں۔

اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی جائے پیدائش سرزمین ہند اور اس کا سلسلہ جدید ہند آریائی زبانوں سے ملتا ہے۔ یہ اس زبان کی خوبی ہے کہ اس نے بہت قلیل مدت میں اپنی سادگی، سلاست، روانی، برجستگی، مٹھاس اور حسن سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ کرلیا اور بہت ہی جلد ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک راج کرنے لگی۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ہماری زبان اردو کو اس کے ابتدائی و تشکیلی دور میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔ دکن میں اسے ''دکنی'' کہا گیا تو گجرات میں ''گجری'' کہہ کر بلائی گئی۔ حضرتِ امیر خسروؒ نے اسے ''ہندی'' اور ''ہندوی'' کا نام دیا۔ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب نے اسے ''اردوئے معلیٰ'' کہا۔ کبھی اسے ''زبانِ دہلوی'' کا نام ملا تو کبھی ''ہندوستانی'' اور کبھی ''ریختہ'' کے نام سے پہچانی گئی۔ بالآخر مختلف نشیب وفراز سے گذرتی اور اپنی مختلف شناخت

بناتی ہوئی یہ زبان ''اردو'' کہلائی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

1- اردو زبان کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی؟

2- مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان میں کون سی زبانیں لائے تھے؟

3- اردو کے مختلف نام کون کون سے ہیں؟

1.4 اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اردو زبان کے ابتدائی دور میں اسے صوفیائے کرام کا بڑا سہارا ملا۔ ہر چند کہ صوفیائے کرام کو اردو زبان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اس زبان کو ترقی دینا ان کا مقصد تھا۔ ان صوفیائے کرام کی زبان فارسی اور عربی تھی لہٰذا ان زبانوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام ہندوستان میں ان کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اور اس وقت اردو زبان ملک میں ایک حصے سے دوسرے حصے تک بولی اور سمجھی جانے لگی تھی اور اس زبان کی دل نشینی اور مٹھاس ہر خاص و عام کو اپنی جانب مائل کر رہی تھی۔ اس زبان کو بولنے اور لکھنے کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے ترقی کے مدارج طے کرتی اردو زبان کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا۔ صوفیائے کرام کے اس عمل سے اردو زبان پند و نصیحت، اخلاقی اقدار اور رشد و ہدایت کا ایک موثر ذریعہ بن گئی جس کی بنا پر اس زبان میں اظہار کی ندرت پیدا ہوتی گئی ۔صوفیائے کرام کی سرپرستی میں اردو کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ جن صوفیائے کرام نے اردو کی ترویج و اشاعت میں اہم خدمات انجام دیں ذیل میں ان کے نام اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

شمار	صوفیائے کرام	(سنہ وفات)	تصانیف/ خدمات
1-	حضرت خواجہ معین الدین چشتی	(1235ء)	ان کی کوئی تصنیف بامعتبر قول ہندی زبان میں نہیں ملتا۔ آپ نے اجمیر میں تبلیغ اسلام کا ایک مستقل نظام قائم کیا۔
2-	بابا فرید گنج شکرؒ	(1265ء)	آپ کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' میں ملتا ہے

3- قاضی حمید الدین ناگوری (1274ء) آپ کے بہت سارے مذہبی رسالے ہیں۔

4- حضرت امیر خسروؒ (1324ء) خالق باری (بچوں کا ادب)، نظمیں، دوہے، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ

5- شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (1370ء) پوربی اور ہندی زبان کے شاعر تھے۔

6- شیخ عین الدین گنج العلمؒ (1392ء) دکنی زبان میں کئی مذہبی رسالے لکھے۔

7- خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (1422ء) معراج العاشقین، ہدایت نامہ، شکار نامہ، تلاوت الوجود، تمثیل نامہ

8- شاہ میراں جی شمس العشاقؒ (1496ء) خوش نامہ، شہادت الحقیقت، شرح مرغوب القلوب

9- شیخ بہاالدین باجن (1506ء) خزانۂ رحمت (تصوف کے شاعر تھے۔)

10- شیخ عبدالقدوس گنگوہی (1538ء) رشد نامہ (ہندی میں شعر کہتے تھے۔)

11- شاہ محمد غوث گوالیاری (1563ء) جواہر خمسہ (آپ کے ہندی قول اور ہندی اشعار قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں۔) جواہر اسرار اللہ

12- شاہ علی محمد جیو گام دہنی (1565ء) بحر الحقائق

13- شیخ وجیہہ الدین احمد علوی (1589ء) ارشاد نامہ، عبرت آدم، کلمۃ الحقائق

14- شاہ برہان الدین جانم (1598ء) خوب ترنگ، بھاؤ بھید

15- شیخ خوب محمد چشتی (1622ء) رسالہ وجودیہ، شرح تمہیدات عین القضات

16- میراں جی خدانما (1663ء) گنج مخفی، عشق نامہ، ظاہر و باطن، گفتار امین الدین

17- شاہ امین الدین اعلیٰ (1675ء)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4- صوفیائے کرام نے اردو زبان کی سرپرستی کیوں کی؟

5- ''خالقِ باری'' کس کی تصنیف ہے اور یہ کیا ہے؟

6- تین صوفیائے کرام کے نام اور ان کی تخلیقات کے نام لکھیے۔

1.5 اُردو زبان کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریات

اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے ہمیں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ جن حضرات نے اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے اپنی تحقیق کے ذریعہ اردو کی جائے پیدائش ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' ان میں محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر مسعود حسین خاں اور نصیر الدین ہاشمی کے نام اہم ہیں۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے ابتدا میں اکثر ایسے افراد نے بحث کی ہے جن کا لسانیات کے علم سے گہرا تعلق نہ تھا۔ ان حضرات میں انشاء اللہ خان انشاء، میر امن دہلوی، امام بخش صہبائی، مولوی عبدالحق اور سیّد سلیمان ندوی کے نام ملتے ہیں۔

انشاء اللہ خان انشاء نے اردو کو عربی' فارسی، ترکی اور برج بھاشا کا مجموعہ کہا تو میر امن دہلوی نے اسے مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا ہے جب کہ امام بخش صہبائی نے رسالہ ''قواعد اردو'' میں یہ لکھا ہے کہ شاہ جہاں آباد (دلّی) میں فارسی اور ہندی کے میل جول سے جو زبان رائج ہوئی اس کا نام اردو قرار پایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' میں آٹھویں، نویں اور گیارہویں صدی کی زبان کے نمونے سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ بزرگانِ دین نے ہندوستانی عوام سے اپنا تعلق قائم کرنے اور ان تک اپنی باتیں پہنچانے کے لیے ان کی اور اپنی زبانوں کو ملانا شروع کیا۔ ان کے اس عمل سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو ایک مخلوط زبان تھی جس کا نام اردو یا ہندوستانی پڑا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ''نقوشِ سلیمانی'' کے ایک مضمون میں یہ لکھا ہے کہ اردو کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہوا مگر مولانا نے بعد میں جو مضامین لکھے ان میں میر امن کے خیال کے حامی نظر آئے۔ کہ اردو مختلف زبانوں اور قوموں کے اختلاط سے وجود میں آئی۔

محمد حسین آزاد نے اپنی لازوال تصنیف ''آبِ حیات'' میں یہ دعویٰ پیش کیا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اردو کا تعلق پنجابی زبان سے جوڑتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں

نے سب سے پہلے سندھ اور پنجاب میں سکونت اختیار کی اور وہاں انھوں نے سرکاری، کاروباری اور سماجی تعلق بتائے رکھنے کے لیے کسی نہ کسی ہندوستانی زبان کا سہارا ضرور لیا ہوگا اور ان کے اس میل جول سے جو زبان وجود میں آئی وہ اس زبان کو دلّی لے آئے۔ یہ زبانیں پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی رہی ہوں گی۔ دہلی میں اس زبان کا تعلق برج اور دوسری زبانوں سے ہوا۔ اس طرح دن رات کے میل جول سے جو زبان وجود میں آئی' اس کا نام بعد میں اردو پڑا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' میں یہ واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا صدر مقام برسہا برس تک آگرہ اور دہلی رہا ہے۔ اس لیے اردو زبان کھڑی بولی سے زیادہ متاثر ہے۔ پروفیسر نصیر الدین ہاشمی اپنی تحقیق ''دکن میں اردو'' میں اردو کا سرچشمہ پراکرت زبان کو مانتے ہیں اور وہ اس لیے کہ مسلمان جب ہندوستان آئے تو اس وقت پیشاور سے لے کر الٰہ آباد تک یہی زبان بولی جاتی تھی۔ جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب ''داستانِ زبان اردو'' میں یہ کہتے ہیں کہ سنسکرت، پالی، شورسینی، مراٹھی، اپ بھرنش ایک زبان کی کئی شکلیں ہیں اور یہ زبان دوآبہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی جس سے سج سنور کر یہ زبانیں بنیں۔ اسی بنا پر شوکت سبزواری اردو کو اپ بھرنش کے روپ سے ماخوذ کرتے ہیں۔

لسانی تحقیق میں ایک اہم اور محترم نام مسعود حسین خان کا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق تحقیق ''مقدمۂ تاریخِ زبان اردو'' ہے جس میں موصوف نے مدلل انداز میں اردو زبان اور اس کے آغاز کے حوالے سے سیر حال بحث کرتے ہوئے ہریانوی زبان پر زیادہ زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہریانی کو ہمارے محققین نے یکساں طور پر نظر انداز کیا ہے جب کہ یہی وہ زبان ہے جو قطع نظر شہر دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ مسعود حسین خان نے اپنے نظریے کے حوالے سے یہ رائے دی ہے کہ اردو برج، ہریانوی اور کھڑی بولی کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے۔ مذکورہ بالا حضرات کے مختلف نظریات اور حوالے کی روشنی میں جو باتیں اور نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں' وہ درج ذیل ہیں۔

1- اردو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔

2- اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔

3- اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی ہے

4- اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی ہے۔

5- اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔

6- اردو کی ابتدا دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

7- اردو کے آغاز کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا نظریہ کیا ہے؟

8- اردو کے تعلق سے جن لوگوں نے نظریے پیش کیے ان میں سے کن کا تعلق علم لسانیات سے نہیں تھا؟

9- اردو کے تعلق سے مسعود حسین خاں نے کیا نظریہ پیش کیا ہے؟

1.6 اردو کا ابتدائی زمانہ

اردو کے ابتدائی زمانے کے تعلق سے ہمیں اپنے مطالعے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ یعنی اردو ادب دکن میں اور اردو ادب شمال میں کیونکہ یہی دو علاقے وہ ہیں کہ جہاں اردو ادب کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔

1.6.1 اردو ادب دکن میں

عزیز طلبہ، ہم نے پچھلے صفحات میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری زبان اردو کس طرح وجود میں آئی اور اس کی ابتدا کے حوالے سے کیا نظریے قائم کیے گئے۔ نیز صوفیائے کرام حضرات نے کس طرح اس زبان کی سرپرستی کی۔ ہم اب یہاں اردو کے ابتدائی زمانے سے تفصیلی بحث کریں گے تاکہ آپ یہ جان سکیں کہ اردو زبان میں ابتدائی ادب کے خدوخال کیا رہے اور وہ کون باکمال حضرات تھے جنھوں نے اردو ادب کی تخلیق و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

اردو ادب کے ابتدائی دور کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر چند اردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا لیکن اس سے قبل ہمیں دکن میں اس کے واضح خدوخال نظر آتے ہیں۔ دکن میں ہمیں اردو ادب کے جو ابتدائی

نمونے ملتے ہیں وہ زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں اور یہ فقرے، جملے، اقوال صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے ہیں اور ان ہی سے اردو ادب کے ابتدائی دور کا سراغ ملتا ہے۔

۱۴ رویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اردو زبان اپنی ایک الگ شناخت قائم کر چکی تھی اور دکن کے مختلف حصوں میں جلال الدین خلجی کے دورِ اقتدار میں یہاں کے لوگ اردو سے آشنا ہو چکے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اردو زبان کے اولین نمونے ہمیں شمالی ہند میں نظر آتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت تک شمالی ہند میں باضابطہ طور پر کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ لیکن یہی اردو زبان جب دکن پہنچتی ہے اور محمد بن تغلق دہلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بناتا ہے تو یہاں نہ صرف اردو کے لیے فضا بے حد سازگار ہو جاتی ہے بلکہ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع ہو جاتا ہے اور ادب کی بھی تخلیق ہوتی ہے۔

اردو ادب کے اس قدیم دور کو ہم با آسانی چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1- بہمنی دور 1350 - 1525ء

2- عادل شاہی دور 1490 - 1686ء

3- قطب شاہی دور 1508 - 1687ء

4- زوالِ گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کا زمانہ 1686 - 1750ء

1- بہمنی دور (1350 - 1525ء)

1347ء میں بہمنی سلطنت کے نام سے ایک خود مختار حکومت بنی جس کا پہلا بادشاہ علاء الدین حسن شاہ بہمنی تھا۔ اس کے عہد میں اردو ادب کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ دکن میں آنے والے صوفیائے کرام حضرات کی سلاطین بہمنی نے قدر و منزلت کی۔ ان بزرگانِ دین کی وجہ سے یہاں اردو کی ترقی کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔ اس عہد میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور دیگر دوسرے صوفی حضرات کی ادبی کوششوں کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ اس دور کے اہم شعرا و مصنفین میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، فخر دین نظامی، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، قطب الدین

قادری اور فیروز کے نام اہم مانے جاتے ہیں۔خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے دکن کے گلبرگہ میں سکونت اختیار کی اور یہاں آپ نے رشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔آپ کا درس فارسی کے علاوہ اردو میں بھی ہوتا تھا۔''معراج العاشقین'' کو ابتدا میں آپ کے نام سے منسوب کیا گیا لیکن نئی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ یہ عادل شاہی دور کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ حسینؒ کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ''شکارنامہ''، ''تمثیل نامہ''، ''خلاصۂ توحید''، ''تلاوت الوجود''، ''اور'' چکی نامہ'' بھی خواجہ صاحب کے نام سے منسوب ہیں۔فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو نہ صرف اردو کی قدیم مثنوی ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ یہ دکنی ادب کا قدیم ترین اور قابل قدر نمونہ ہے۔میراں جی شمس العشاق اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ان کی چار کتابیں ملتی ہیں۔(1) خوش نامہ (2) خوش مغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرعوب۔سیّد شاہ اشرف بیابانی کا ذکر بہمنی دور کے باکمال شعرا میں ہوتا ہے۔آپ میراں جی شمس العشاق کے ہم عصر بھی ہیں۔آپ نے ایک مثنوی ''نوسرہار'' کے نام سے لکھی جسے بے حد مقبولیت ملی۔اس کے علاوہ مذہبی مسائل پر بھی ایک نظم ''لازم المبتدی'' لکھی۔قطب الدین قادری فیروز اس دور کے ایک باکمال سخنور ہیں۔ان کی ایک مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ کچھ غزلیں بھی ملتی ہیں۔اس عہد کے دیگر شعرا میں قریشی بیدری کی جنسیات کے موضوع پر ایک مثنوی ''بھوگ بل'' ملتی ہے جب کہ مشتاق اور لطفی کی چند غزلیں اور قصیدے بھی ملتے ہیں۔

2- عادل شاہی دور (1490 - 1686ء)

یوسف عادل شاہ عادل شاہی سلطنت کا بانی تھا۔دکن میں عادل شاہی دور کے سلاطین نے نہ صرف شعر و ادب کے ارتقا میں نمایاں حصہ لیا بلکہ مقامی تہذیب و روایت اور اقدار کی ترویج و اشاعت کا کام بھی کیا۔اس عہد میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مرثیے کے علاوہ نثر نگاری نے بھی ترقی کی۔لیکن عادل شاہی عہد میں جب ہم اردو ادب کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں نثر کے مقابلے میں شاعری کا چلن زیادہ رہا ہے۔اس عہد کے سلاطین علم و ادب سے عقیدت رکھتے تھے جن میں حسن شوقی، ملک الشعرا نصرتی، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور ہاشمی بیجا

پوری کے نام نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ حسن شوقی مثنوی نگار اور غزل گو کی حیثیت سے مقبولیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک دیوان ملتا ہے اور دو مثنویاں۔ ان کی پہلی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' ہے جس میں 620 اشعار ہیں جب کہ دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ'' ہے جو 1214 اشعار پر مشتمل ہے۔ محمد نصرت نصرتی کا شمار عادل شاہی عہد کے عظیم شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی 3 مثنویاں ہیں۔ (1) گلشنِ عشق (2) علی نامہ (3) تاریخ اسکندری۔ اس کے علاوہ غزل، قصیدہ اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی موجود ہے۔ نصرتی کو قصیدے کے حوالے سے دکن کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی کو بچپن سے ہی علم و ادب کا بے حد شوق تھا اور اس نے شاعری کی کم و بیش تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ شاہی کی کلیات میں غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں کے علاوہ گیت بھی ملتے ہیں۔ ہاشمی بیجاپوری کا شمار عادل شاہی عہد کے آخری دور کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہاشمی پیدائشی طور پر بصارت سے محروم تھا لیکن بعض جگہوں میں یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ چیچک کے مرض کے سبب ہاشمی کی بینائی جاتی رہی۔ ہاشمی کی تصانیف میں دیوانِ غزلیات کے علاوہ دو مثنویاں ملتی ہیں جن میں ''یوسف و زلیخا'' اہم مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں 5128 اشعار ہیں۔ دوسری مثنوی عشقیہ ہے۔ ہاشمی کو مثنوی کے علاوہ قصیدہ گوئی اور غزل گوئی پر بھی قدرت تھی۔

اوپر جن شعرا کا ذکر آیا ہے یہ وہ اہم نام ہیں جنھوں نے عادل شاہی عہد میں اردو زبان و ادب کے ارتقا میں اہم کارنامے انجام دیے۔ ان کے علاوہ دیگر قابل ذکر شعرا میں جانم، عبدل، مقیمی، رستمی، علی رحمتی، ایاغی، صنعتی، عاجز، امین الدین علی اعلیٰ، معظم بیجاپوری اور مخدوم شاہ حسینی کے نام اہم ہیں۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عادل شاہی دور دکنی ادب کا وہ سنہری دور تھا جس میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی پرورش و پرداخت کا کام بھی منظم طریقے سے انجام پایا اور یہاں نثر کا پہلا رسالہ ''کلمۃ الحقائق'' برہان الدین جانم نے لکھا۔

3. قطب شاہی دور (1508 - 1687ء)

قطب شاہی دور کو دکن میں اردو شعر و ادب کی ترقی کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں اردو ادب کے

فروغ کی تمام کوششیں کی گئیں۔اس عہد کے ممتاز ومقبول شعراوادبا میں اسداللہ وجہی، محمد قلی قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہم ہیں۔

وجہی صرف ایک ممتاز شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کا نثر نگار بھی تھا۔شاعری میں وجہی کا لازوال کارنامہ ''قطب مشتری'' ہے جو 1018 ہجری میں لکھی گئی اور نثر میں ان کا اہم کارنامہ ''سب رس'' ہے جو قدیم طرز کی ایک داستان ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔یوں تو انھوں نے غزل، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل ان کی محبوب صنفِ سخن رہی ہے۔

قلی قطب شاہ کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔غواصی قطب شاہی عہد کا ایک نامور اور بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کی چار مثنویوں (1) مینا ستونتی (2) سیف الملوک و بدیع الجمال (3) طوطی نامہ (4) طریقت کے علاوہ نظموں، قصیدوں، مرثیوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی موجود ہے۔غواصی کی مثنویاں دکنی عہد کی شاہ کار مثنویاں کہلاتی ہیں۔ابن نشاطی بھی قطب شاہی دور کا مشہور ومقبول شاعر ہے۔نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' کا شمار اہم مثنویوں میں ہوتا ہے۔یہ مثنوی 1744 اشعار پر مشتمل ہے۔

4- زوال گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کا زمانہ (1686-1750ء)

عادل شاہی حکومت کے علاوہ دکن میں دبستانِ بیجاپور اور دبستانِ گول کنڈہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۷ رویں صدی عیسوی میں ان دبستانوں کے زیر اثر تخلیق پانے والے ادب میں مقامی تہذیبی عناصر کی جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں۔یہاں جن لوگوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کا بیڑا اپنے کاندھوں پر اٹھایا ان میں ولی محمد اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کو عظیم مقام حاصل ہے کیوں کہ یہ دونوں صاحبِ کمال دکنی شاعری کی عظیم روایت کے آخری تاجدار مانے جاتے ہیں۔ان ہی حضرات نے شمالی ہند کے شعرا کو اردو زبان میں شعر گوئی کی طرف مائل کیا اور جب 1719ء میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو ہر خاص وعام کی زبان پر ولی کے شعر جاری ہو گئے۔ولی کے دیوان میں مثنوی، غزل، رباعی، قطع اور مخمس وغیرہ تمام اصنافِ سخن موجود ہیں لیکن ولی کی شہرت ومقبولیت کا اصل سبب ان کی غزل

گوئی ہے۔ ولی نے اپنی شاعری کے ذریعہ دکن کی شعری روایت اور رجحانات کی آبیاری کی ہے۔

ولی کے بعد سراج اورنگ آبادی اردو کے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام شعری اصناف میں اپنے نقوش قائم کیے ہیں۔ ان کی کلیات میں غزل، قصیدہ، مرثیہ مثنوی اور رباعیاں بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی محور عشق ہے۔ یوں تو سراج نے 12 مثنویاں لکھی ہیں لیکن ان میں ''بوستانِ خیال'' اہم ترین ہے جس میں 1160 اشعار ہیں۔ اس دور کے دیگر شعرا میں قاضی محمود بحری، سیّد محمد فراقی، داؤد اورنگ آبادی، فدوی اورنگ آبادی، وجدی، ضعیفی، ذوقی، ولی ویلوری، شاہ تراب اور عشرتی کے نام قابل ذکر ہیں۔

1.6.2 اردو ادب شمالی ہند میں

اردو شعر و ادب کو اپنے ابتدائی ایام میں سرزمینِ دکن میں فروغ پانے کے لیے بہت سے سہارے ملے۔ دکن کے بعد شمالی ہندوستان میں دہلی اردو ادب کے ایک مضبوط مرکز کی حیثیت سے ابھری اور یہاں اردو زبان و ادب کے لیے ایسا خوش گوار ماحول بن گیا کہ شمالی ہند کے وہ شعرا و ادبا بھی جو اس سے قبل فارسی میں شعر کہتے تھے' اردو کی طرف مائل ہونے لگے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل یہاں اردو شعر گوئی کا رواج نہ تھا۔ ولی کی آمد سے قبل جو شعرا کبھی کبھار اردو میں شعر کہتے تھے ان میں سراج الدین علی خاں آرزو، ٹیک چند بہار اور جعفر زٹلی کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جو فارسی زبان میں اپنی شاعری کا اعتراف کروا چکے تھے۔

یہ دور وہ دور ہے جسے ہم مغلیہ سلطنت کے انتشار اور زوال کا عہد کہتے ہیں۔ اس وقت یہاں سرکاری زبان فارسی تھی اور ہندی زبان کی حیثیت محض ایک بولی کی تھی لہٰذا قدرتی طور پر اردو میں فارسی اور ہندی کے الفاظ دخیل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہاں اردو شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تو ایرانی شاعری کی تمام شعری خصوصیات یعنی تصنع، تصور پرستی اور مشکل پسندی اردو شاعری میں بھی در آئیں۔ شمالی ہند میں اردو میں شعر گوئی کا رواج اس وقت زیادہ فروغ پایا جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور اس کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دی۔ اس کا اثر دہلی کی شاعری پر یہ

پڑا کہ شمالی ہند میں شعر گوئی کا آغاز ان شعرا کے ہاتھوں ہوا جنھوں نے ولؔی کی پیروی میں ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ ظاہر ہے انھیں ریختہ پر قدرت نہ تھی۔ اس لیے ایہام گوئی کا سلسلہ شروع ہوا جس کا اثر میرؔ و سوداؔ کے دور تک رہا۔ یہاں ولی سے متاثر ہو کر جن شعرا نے اردو میں شعر کہے ان میں حاتمؔ، آبروؔ، شاکرؔ، ناجیؔ، فغاںؔ، فائزؔ اور یکرنگؔ کے نام شامل ہیں۔

ولی کی شمالی ہند میں آمد اردو شعر و ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ ولؔی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دکنی اور شمالی ہند کی زبانوں کو ملا کر ایک ایسی خوش نما ادبی شکل عطا کی جس کو دکن اور شمال کے لوگوں نے دل سے قبول کیا۔ ولی کے اس اثر کا کھلے دل سے اعتراف اس دور کے بیشتر شعرا نے کیا ہے۔ مثلاً داؤد کہتے ہیں :

علی کی ہے قسم سن شعر تیرا
کہے عالم ولی ثانی نہیں ہے

آبرو کہتے ہیں :

آبرو شعر ہے تیرا اعجاز
گو ولی کا سخن کرامت ہے

حاتم نے کچھ یوں لکھا :

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولؔی ، ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

ولی کی ان ہی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر ان کے ہم عصر شعرا نے جہاں انھیں اعلیٰ درجے کا شاعر کہا وہیں خدائے سخن میر تقی میرؔ نے انھیں ریختہ کا مسلم الثبوت استاد کہا۔ جب کہ محمد حسین آزاد انھیں اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔ ولؔی کے اثر سے شمالی ہند میں اردو شاعری مختلف مراکز میں ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ ان میں دبستانِ دہلی

اور دبستانِ لکھنؤ کو اردو شاعری کے فروغ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

دبستانِ دہلی اردو کا ایک اہم دبستان ہے جس سے وابستہ شعرا کے یہاں ہمیں داخلیت، سنجیدگی اور احساسات و کیفیات کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ان شعرا کے یہاں اپنے عہد کی تباہ حال دہلی کی زندہ تصویریں بھی ملتی ہیں۔ میر کی شاعری میں ان باتوں کا بین ثبوت موجود ہے۔ دبستانِ دہلی کی دوسری نمایاں خصوصیت تصوف اور اظہار کی روانی ہے۔ دبستانِ دہلی سے وابستہ شعرا کے یہاں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

1- اظہارِ بیان میں سادگی اور سلاست

2- کلامِ بیان میں ہر جگہ برجستگی

3- معاملات اور واقعات حقیقی

4- ابتذال سے پرہیز

5- آمد کی کیفیت کی کلام میں موجودگی

6- مختصر غزلیں سہل ممتنع کی شکل میں

7- اخلاقیات کا غالب رنگ

یہ وہ خوبیاں ہیں جنھیں دبستانِ دہلی کے شعرا کی نمایاں خصوصیات کہہ سکتے ہیں۔

دبستانِ دہلی کے شعرا میں جن کو نمایاں عظمت حاصل ہوئی ان میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، سوزؔ، مظہرؔ جانِ جاناں، عبدالحئی تاباںؔ، میر حسنؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ، میر مہدی مجروحؔ، ذکیؔ، رخشاںؔ، نیرؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

دبستانِ دہلی کی طرح دبستانِ لکھنؤ میں بھی غزل کو بے حد مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ مثنوی اور مرثیہ کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ میر حسن نے جہاں مثنوی کو اعلیٰ مقام پر پہنچایا وہیں انیس و دبیر نے مرثیے کو اپنی انتہا کو پہنچا دیا۔

مرثیے ابتدا میں ہر چند کہ دکن میں لکھے گئے لیکن اس صنفِ شاعری کو لکھنؤ میں جو ترقی ملی وہ قابلِ فخر ہے۔ ضمیر، خلیق، انیس، دبیر، تعشق، مونس اور اُنس ایسے باکمال مرثیہ گو ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ دبستانِ لکھنؤ کے یوں تو بہت سے شعرا ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے دامن کو غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت اور ریختی سے سرفراز کیا۔ ان میں اہم اور قابلِ ذکر شعرا کے حوالے سے شیخ غلام ہمدانی مصحفی، شیخ انشاء اللہ خاں انشاء، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ امام بخش ناسخ، میر ببر علی انیس، مرزا سلامت علی دبیر، حکیم تصدق حسین خان مرزا شوق وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

(الف) شمالی ہند میں اردو نثر

جب ہم شمالی ہند میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں شاعری کے ساتھ نثر کا کام بھی ہوا۔ ''فضل علی خاں فضلی'' کی تصنیف ''کربل کتھا'' شمالی ہند میں اردو نثر کا پہلا نمونہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے جس کا موضوع واقعاتِ کربلا ہے۔ شمالی ہند میں لکھی جانے والی پہلی نثری داستان عیسیٰ خان بہادر کا ''قصہ مہر افروز و دلبر'' ہے۔ اس کی زبان پر کھڑی بولی کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے۔ اسے ہم شمالی ہند کی قدیم نثر کا ایک نمونہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے ''نوطرزِ مرصع'' لکھی جس میں اردو نثر کو فارسی کے اسلوب اور رنگ سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ جب کہ مہر چند کھتری نے 'نوآئینِ ہندی'' لکھی تو اس کی نثر سادہ اور عام فہم رکھی جس میں روزمرہ کی بول چال کے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل سادہ اور رواں نثر کی روایت کا اولین نمونہ ہے۔ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے سادہ اور عام فہم زبان میں ''عجائب القصص'' نام کی داستان لکھی جس کے مطالعے سے ہمیں اس دور کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ سیّد شاہ حسین حقیقت نے میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کی کہانی سے ملتی جلتی ایک داستان ''جذبۂ عشق'' کے نام سے لکھی۔ سیّد عبدالولی عزلت اردو کے وہ اولین شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا۔

اردو نثر کے ارتقائی سفر میں قرآن مجید کے اردو تراجم بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ چوں کہ ان کی وجہ سے اردو نثر میں علمی مسائل کے اظہار میں قوت پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں شاہ محمد رفیع الدین، شاہ مراد اللہ انصاری اور شاہ عبد

القادر کے نام اہم ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کے تراجم وتفاسیر سے اردو نثر کے فروغ میں حصہ لیا۔ شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کو اس وقت عروج حاصل ہوا جب 1800ء میں شہر کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ اس میں ہندوستانی زبانوں کے شعبہ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اس کالج کے توسط سے گل کرسٹ کی سربراہی میں اردو نثر کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ اسی کالج میں گل کرسٹ کی ایما پر میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار'' جیسی لازوال کتاب پیش کر کے اردو نثر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہمیں دکھایا جسے اردو نثر کے ارتقا میں سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کریں۔

10- دکن میں اردو ادب کو کتنے ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں؟

11- ''کدم راؤ پدم راؤ'' کس کی تخلیق ہے اور کیا ہے؟

12- ولی کا دیوان دہلی کب پہنچا؟

13- ولی کی دہلی آمد سے پہلے اردو میں شعر کہنے والے شعرا کے نام بتایئے۔

14- دبستانِ دہلی کے تین اہم شعرا کے نام لکھیے۔

15- دبستانِ لکھنؤ کے تین اہم شعرا کے نام لکھیے۔

1.7 خلاصہ

اردو زبان کی ابتدا تقریباً ایک ہزار عیسوی کے آس پاس کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں ہوئی۔ جب ابتدا میں مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں اپنے ساتھ لائے۔ یہاں انھوں نے اہلِ ہند کے ساتھ اپنے تعلقات تاجرانہ حیثیت سے، سماجی حیثیت سے، ثقافتی حیثیت سے اور روزمرہ کے معاملات حل کرنے کے لئے استوار کیے۔ جب ان میں اور ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے درمیان تعلقات کی راہیں مزید ہموار ہوئیں تو انھوں نے اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے کچھ اپنے الفاظ اور کچھ مقامی بولیوں کا سہارا لیا۔ اس طرح ایک نئی

زبان کا وجود عمل میں آیا۔ زبان اردو کو اس کے ابتدائی و تشکیلی دور میں مختلف ناموں مثلاً دکنی، گجری، ہندی، ہندوی، اردوئے معلیٰ، ہندوستانی اور ریختہ وغیرہ سے بھی پہچانا گیا۔ اردو زبان کے ابتدائی دور میں اسے صوفیائے کرام کا بڑا سہارا ملا۔ چوں کہ یہ اس وقت تک عوام میں بحیثیت بولی کے مقبول ہو چکی تھی اس لیے صوفیائے کرام نے ترقی کے مدارج طے کرتی اردو زبان کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا۔

اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے مختلف محققین نے مختلف نظریات قائم کیے، جن میں محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر مسعود حسین خاں، نصیر الدین ہاشمی کے نام اہم ہیں۔ دکن میں اردو ادب کے اس قدیم دور کو بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی، زوالِ گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

دکن کے بعد شمالی ہندوستان میں دہلی اردو ادب کے ایک مضبوط مرکز کی حیثیت سے ابھری اور یہاں اردو زبان و ادب کے لیے ایک خوش گوار ماحول بن گیا ہر چند کہ اس وقت یہاں سرکاری زبان فارسی تھی اور ہندی زبان کی حیثیت محض ایک بولی کی تھی۔ دراصل شمالی ہند میں اردو میں شعر گوئی کا رواج اس وقت زیادہ فروغ پایا جب ولؔی کا دیوان دہلی پہنچا اور اس کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دی۔ اس کے بعد سے شمالی ہند میں اردو شاعری مختلف مراکز پر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ بعد میں شمالی ہند میں دہلی اور لکھنؤ زبانِ اردو کے دو اہم دبستان کے طور پر ابھرے۔

دبستانِ دہلی اردو کا ایک اہم دبستان ہے جس سے وابستہ شعرا کے یہاں ہمیں داخلیت، سنجیدگی اور احساسات و کیفیات کا برملا اظہار ملتا ہے جب کہ یہاں کے شعرا کی دوسری نمایاں خصوصیت تصوف اور اظہار کی روانی ہے۔ دبستانِ دہلی کے شعرا میں جن کو نمایاں عظمت حاصل ہوئی، ان میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، سوزؔ، مظہرؔ جانِ جاناں، عبدالحئ تاباںؔ، میر حسنؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ، میر مہدی مجروحؔ، ذکیؔ، رخشاںؔ، نیرؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دبستانِ دہلی کی طرح دبستانِ لکھنؤ میں بھی غزل کو بے حد مقبولیت حاصل تھی

۔اس کے علاوہ مثنوی اور مرثیہ کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ میر حسن نے جہاں مثنوی کو اعلیٰ مقام پر پہنچایا وہیں انیس و دبیر نے مرثیے کو اپنی انتہا کو پہنچا دیا۔ ضمیر، خلیق، انیس، دبیر، تعشق، مولس اور الس ایسے باکمال مرثیہ گو ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ دیگر اصناف پر قادر شعرا میں ہمیں یہاں مصحفی، انشاء، آتش، ناسخ اور شوق وغیرہ ملتے ہیں۔

جب ہم شمالی ہند میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں شاعری کے ساتھ نثر کا کام بھی ہوا۔ ''فضل علی خاں فضلی'' کی تصنیف ''کربل کتھا'' شمالی ہند میں اردو نثر کا پہلا نمونہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے۔ شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کو اس وقت عروج حاصل ہوا جب 1800ء میں شہر کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور یہاں دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

1.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1- اردو زبان کے آغاز کا جائزہ لیجیے۔

2- بہمنی دور کے اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

3- شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1- اردو زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ لیجیے۔

2- دکن میں اردو ادب کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

3- شمالی ہند میں اردو زبان و ادب کے آغاز کا جائزہ لیجیے۔

1.9 فرہنگ

تشکیل شکل دینا، بنانا،

جامع	مکمل، پورا	علم بردار	پرچم اٹھانے والا
وارد ہونا	آنا	ترسیل	روانہ کرنا، پہنچانا، بھیجنا
نشیب وفراز	اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ	گرویدہ	اپنا بنانا
دل نشینی	دل میں جگہ بنانا، دل میں بیٹھ جانا، پسند آنا		
سازگار	موافق، مناسب	پند	نصیحت
مدارج	مختلف مرحلے	مفید	اچھا
ندرت	نیاپن		
تصوف	علم معرفت، دل سے خواہشوں کو دور کرنے خدا کی طرف دھیان لگانا۔		
لسانیات	زبانوں کا علم	اختلاط	ملاوٹ
تصنع	مصنوعی پن، نقل آمیز	ریختہ	ٹوٹی پھوٹی، اردو کا پرانا نام
ایہام گوئی	وہم میں ڈالنا، شعر میں وہ صنعت جس میں شاعر ایک لفظ کے دو معنی لائے۔		

1.10 معاون کتابیں

1- سیّد احتشام حسین — اردو کی کہانی

2- پروفیسر مسعود حسین خان — مقدمہ تاریخِ زبان اردو

3- شمس الرحمٰن فاروقی — اردو کا ابتدائی زمانہ

4- پروفیسر سیّدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین — تاریخِ ادب اردو (جلد اول)

1.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

1- اردو زبان کی ابتدا تقریباً 1000ء کے آس پاس کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں ہوئی۔

2- جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں اپنے ساتھ لائے۔

3- اردو کے مختلف نام رہے ہیں : دکنی، گجری، ہندی، ہندوی، اردوئے معلّٰی، زبانِ دہلوی، ہندوستانی اور ریختہ

4- صوفیائے کرام نے اردو زبان کی سرپرستی اس لیے کی کہ یہ عوام کی زبان تھی اور اس کے ذریعہ عوام تک اسلامی تعلیمات با آسانی پہنچائی جاسکتی تھیں۔

5- ''خالقِ باری'' حضرتِ امیر خسروؒ کی تصنیف ہے اور یہ بچوں کا ادب ہے۔

6- میراں جی شمس العشاق (شہادت الحقیقت)، شیخ بہاء الدین باجن (خزانۂ رحمت)، میراں جی خدانما (رسالہ وجودیہ)

7- اردو کے آغاز کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ ہے کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔

8- انشاءاللہ خاں انشاء، میر امن دہلوی، امام بخش صہبائی، مولوی عبدالحق اور سیّد سلیمان ندوی

9- اردو کے تعلق سے مسعود حسین خان نے یہ نظریہ پیش کیا ہے اردو برج، ہریانوی اور کھڑی بولی کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے۔

10- دکن میں اردو ادب کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بہمنی دور، عادل شاہی دور، قطب شاہی دور، زوالِ گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کا زمانہ

11- ''کدم راؤ پدم راؤ'' فخر الدین نظامی کی مثنوی ہے۔

12- ولی کا دیوان 1719ء میں دلّی پہنچا۔

13- ولی کی آمد سے پہلے اردو میں شعر کہنے والے شعرا میں سراج الدین علی خان آرزو، ٹیک چند بہار اور جعفر زٹلی ہیں

14- دبستانِ دہلی کے تین اہم شعرا میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ ہیں۔

15- دبستانِ لکھنؤ کے تین اہم شعرا آتشؔ، مصحفیؔ اور ناسخؔ ہیں۔

اکائی 2 : اردو ادب کا سنہرا دور
(ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ تک)

ساخت

2.1 اغراض و مقاصد

2.2 تمہید

2.3 پس منظر

2.4 اردو شاعری کا سنہرا دور

2.5 اردو نثر کا عہدِ زریں

2.5.1 فورٹ سینٹ جارج کالج، مدراس

2.5.2 فورٹ ولیم کالج، کلکتہ

2.5.3 دہلی کالج، دہلی

2.6 چند اہم نثر نگار

2.7 خلاصہ

2.8 نمونۂ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 معاون کتابیں

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

2.1 اغراض ومقاصد

اردو ادب کا سنہرا دور ہندوستان کی تاریخ کا وہ عہد ہے جس میں عظیم الشان مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور بہادر شاہ ظفر کے عہد کا آفتاب مائل بہ غروب تھا۔ علم و ادب کے مرکز دہلی میں تباہی و بربادی کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا تھا۔ ان پرآشوب حالات میں بہت سارے اہل کمالِ دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے لیکن ایسی صورت حال میں بھی ذوق، غالب اور مومن جیسے نامور شعرا کے علاوہ بہت سارے شعرا نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا اور آخر دم تک دہلی کے ہی ہو رہے۔ یہی زمانہ دراصل اردو شعر و ادب کے عروج کا وہ زمانہ ہے جسے ہم اردو ادب کا سنہرا دور کہتے ہیں۔ اردو ادب کے سنہرے دور سے آپ کو آگاہ کرنے کے لئے یہ اکائی نصاب میں شامل کی گئی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس اکائی کے مطالعے سے آپ اردو ادب کے اس سنہرے دور سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

2.2 تمہید

ملکوں کی تاریخ میں ایسے بھی دور آتے ہیں کہ جب سیاسی سطح پر قوم و معاشرہ انتشار کا شکار ہوتا ہے، تہذیبی روایات دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ایک خاص قسم کی بے حسی، ذہنی فرار اور اجتماعی کرب کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ ایسے میں ادب عروج کے منازل طے کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے یہ سوال اہل فکر کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اجتماعی کرب اظہار کے انفرادی طریقوں سے سامنے آتا ہے۔ معاشرے کی عام سوچ اور کرب و اضطراب چند اہم تخلیق کاروں کے ذریعہ ادب کا حصہ بنتے ہیں۔ زندگی کے مسائل کا احساس اور بہتر زندگی کی خواہش حقیقت کے ساتھ تخیل کی آمیزش کا سبب بنتی ہے اور اسی لیے اس دور کا ادب بہترین ادب قرار پاتا ہے۔ اردو ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ مغل حکومت کا زوال، سیاسی و سماجی انتشار اور تہذیبی انحطاط کا دور اردو ادب کا سنہرا دور قرار پاتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی دور کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔

2.3 پس منظر

جب ہم اردو ادب کے سنہرے دور کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب کے سنہرے دور کا عہد سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر پریشانیوں اور مصیبتوں کا عہد ہے۔ اورنگ زیب کی وفات 1707ء میں ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا۔ اس کے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی جس میں شہزادہ معظم فتح یاب ہو کر بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اور پانچ سال حکومت کرنے کے بعد 1712ء میں انتقال کر گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے معز الدین نے جہاں دار شاہ کے لقب سے حکومت سنبھال لی۔ یہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے 1713ء میں قتل کر دیا گیا اور اس کے بھتیجے فرخ سیر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن 1719ء میں اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک مختصر عرصے کے لیے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ تخت نشین ہوئے۔ 1719ء میں جہاں دار شاہ کے بیٹے روشن اختر نے محمد شاہ کے لقب سے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا جو محمد شاہ رنگیلا کے نام سے بھی مشہور ہے۔ محمد شاہ سیاسی اعتبار سے ایک نااہل بادشاہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرونی اور بیرونی طاقتوں کو سر اٹھانے کا بھرپور موقع ملا اور دلّی پر ہر طرف سے حملے ہونے لگے۔ چہار طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ان حالات میں میر تقی میرؔ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

اب خرابہ ہوا جہاں آباد

ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

محمد شاہ وہ پہلا مغل بادشاہ ہے جس کا کلام ہمیں اردو میں ملتا ہے۔ اسے نہ صرف علم و ادب سے لگاؤ تھا بلکہ اس نے کئی راگ راگنیاں، گیت اور ٹھمریاں بھی ایجاد کیں کیوں کہ اسے فنونِ لطیفہ سے بے حد لگاؤ تھا اور اس کے دربار میں کئی نامور موسیقار بھی تھے۔ محمد شاہ رنگیلا کے بعد حکومت احمد شاہ کو ملی جس کا انتقال 1755ء میں ہوا۔ اس کے بعد

جہاں دار شاہ کا بیٹا عزیز الدین عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا لیکن 1761ء میں اس کا بھی قتل کر دیا گیا اور اورنگ زیب کے پڑ پوتے کو شاہ جہاں ثانی کے لقب سے حکمراں بنا دیا گیا۔ شاہ جہاں ثانی کے دور میں اقتدار کی طاقتیں زور پکڑنے لگیں۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ شاہ جہاں ثانی کو اندھا کر کے تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ انگریزوں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے 1803ء میں لارڈ کیننگ کی سربراہی میں دلی پر قبضہ کر لیا لیکن نام بادشاہ کا ہی رہا اور اس کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہوئے ان کی ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں ہی رہی۔ ایسے پر آشوب حالات میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ انگریز بہادر شاہ ظفر کو ناپسند کرتے تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ کسی بہانے انھیں تخت سے بے دخل کر دیا جائے۔ اسی بنا پر بہادر شاہ ظفر کو 1857ء کی بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں نومبر 1862ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

ہر چند کہ یہ دور سیاسی اور سماجی افراتفری کا دور تھا لیکن اس کے باوجود اس عہد میں اردو ادب کو بے حد فروغ ملا اور شعرا و ادبا نے اپنی تخلیقات میں اس عہد کی نہ صرف تصویریں پیش کیں بلکہ احتجاج بھی کیا اور یہیں سے اردو ادب کے سنہرے دور کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

1- اورنگ زیب کی وفات کب ہوئی؟

2- میر نے دہلی کے حالات پر کون سا شعر کہا؟

3- بہادر شاہ ظفر کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

2.4 اردو شاعری کا سنہرا دور

اردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ کا عہد اردو شاعری کے عروج کا عہد ہے۔ ہر چند کہ یہ عہد سیاسی و سماجی افراتفری اور ہنگامی حالات کا تھا لیکن اس کے باوجود اس عہد میں جس طرح سے شاعری کو فروغ ملا

اس بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ میرؔ اور سوداؔ کا عہد اردو شاعری کا زریں عہد ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں مظہرؔ جانِ جاناں، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے نام آتے ہیں۔

1- مرزا مظہر جانِ جاناں

مرزا مظہر یوں تو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن انھوں نے اردو میں بھی شاعری کی۔ تحقیق کے مطابق ان کا اردو میں کوئی دیوان موجود نہیں ہے البتہ مختلف تذکروں کے حوالے سے ان کے اشعار کی تعداد 124 بتائی جاتی ہے جسے ''مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا اردو کلام'' کے عنوان سے عبدالرزاق قریشی نے بمبئی سے 1961ء میں شائع کیا۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی، سلاست اور جذبات و احساسات کی حسین آمیزش ہے۔

یہ دل کب عشق کے قابل رہا
کہاں اس کو دماغ و دل رہا

☆☆

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

2- میر تقی میرؔ

میرؔ اردو شاعری کا وہ روشن ستارہ ہے جس کی چمک دمک رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ میر کا عہد احمد شاہ ابدالی، سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے حملے کا دور ہے۔ میر کے عہد میں دلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ میر جیسے حساس شاعر نے اس کی تصویر اپنے کلام میں جگہ جگہ پیش کی ہے۔ میر نے اپنے عہد کی دھڑکن کو اپنی شاعری کے حوالے سے اس طرح پیش کیا کہ ان کی آواز اٹھارہویں صدی کی آواز بن گئی۔ میر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔ ان کی شاعری کی نغمگی، سوز و گداز، دلکشی اور سلاست نے انھیں اردو کا عظیم غزل گو بنا دیا۔ انھیں خدائے سخن بھی کہا جاتا ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

☆☆

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے

دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میرؔ کے چھ دواوین اردو میں ہیں اور ایک دیوان فارسی میں بھی ملتا ہے۔

3- خواجہ میر دردؔ

دردؔ بحیثیت صوفی شاعر مشہور ہیں کیوں کہ انھوں نے ابتدا ہی سے تصوف کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا۔ انھوں نے درویشانہ زندگی گذاری۔ درد کا ایمان و یقین جن چیز پر تھا وہ خیالات ان کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کو اردو شاعری کا ایک اہم ستون کہا جاتا ہے۔ سادگی اور بان کی دلکشی ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ شاعری ان کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی

ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے

میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

''دیوانِ دردؔ'' کے نام سے ان کا اردو میں کلام ملتا ہے جس میں تقریباً 1500 اشعار ہیں۔

4- سوداؔ

سوداؔ کا عہد وہی ہے جو میر کا ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد سودا لکھنؤ چلے آئے۔ انھوں نے ابتدا میں فارسی میں شاعری کی۔ پھر خان آرزو کے مشورے پر اردو شاعری کی طرف مائل ہوئے اور بہت جلد اپنا ایک منفرد مقام اردو غزل

کے میدان میں بنالیا۔ گو کہ ان کا خاص میدان قصیدہ نگاری ہے لیکن غزل میں بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مستحکم ہے۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

☆☆

جس روز کسی اور پر بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

5- سیّد انشاء اللہ خاں انشاء

اس عہد کے ایک ممتاز شاعر انشاء اللہ خاں انشاء ہیں۔ ان کے کلام میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انشاء کو زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی، پشتو اور پنجابی سے بھی واقف تھے۔ ان کی کلیات اردو ادب کا اہم سرمایہ ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ اور قطعہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں خیال کی تازگی اور بیان کی ندرت اہمیت رکھتی ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
لگی غلیل سے ابرو کی دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسے ہے کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

6- مصحفی

مصحفی بھی ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے دہلی سے ہجرت کی اور لکھنؤ کو اپنا مسکن بنالیا۔ ان کا شمار اردو کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ اردو میں ان کے آٹھ دواوین ہیں۔ ان کے کلام میں جذباتیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ زبان و بیان اور فن پر انھیں قدرت حاصل تھی۔

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

☆☆

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا

7- قلندر بخش جرأت

جرأت کا شمار دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی لیکن بچپن ہی میں لکھنؤ آ گئے اور دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح جرأت نے بھی تصوف سے خود کو الگ رکھا۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں سوقیانہ جذبات، ہوس پرستی اور فحش گوئی در آئی۔ البتہ ان کے یہاں زبان و بیان کی صفائی، سادگی اور فصاحت کی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔

پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری
وہ منہ کو پھیر کے کہتا ہے اف پناہ تری

☆☆

اپنے پہلو سے جب وہ اٹھ کے چلا اے جرأت
اس کا منہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

8- امام بخش ناسخ

ناسخ کا شمار دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ناسخ نے شاعری سے زیادہ زبان و بیان کی اصلاح، قواعد اور فنِ شاعری پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں پھیکا پن نظر آتا ہے۔ تصنع اور تکلف سے انھوں نے بہت زیادہ کام لیا ہے۔ ان کی حیثیت شاعر سے زیادہ شاعری اور زبان کے مصلح کی ہے۔

مار ڈالا جسے جان کے جوں قاتل نے
زلفِ مشکیں میں یقین ہے وہ مرادل ہوگا

☆☆

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے، ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

9- خواجہ حیدر علی آتش

دبستانِ لکھنؤ کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے آتش کا شمار ہوتا ہے۔ آتش نے اپنے کلام میں داخلی اور خارجی موضوعات کا اظہار سلیقے سے کیا ہے جس میں شوخی، رنگینی، روانی اور زبان کی سادگی کا حسن جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ شاعری کے حوالے سے آتش کا یہ کہنا ہے کہ شاعر کا رنگین دلکش خیال تصویر بن کر جب شعر کا روپ اختیار کرتا ہے تو اس خیال کے اظہار میں شاعر لفظوں کو ایسے سجاتا ہے جیسے کوئی جوہری نگینے جڑتا ہے۔ آتش کا کلام ان کی اس رائے پر پورا اترتا ہے :

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

☆☆

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان کر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

10- ذوقؔ

ذوقؔ اپنے عہد کے ممتاز و مقبول شاعر تھے۔ آپ شاہ نصیر کے شاگرد اور بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ انھیں دربارِ دہلی سے ''خاقانیِ ہند'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ غزل کے علاوہ ذوق کا شمار قصیدے کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ذوق کے

کلام کی نمایاں خوبی تازگیِ مضمون، خوبیِ محاورہ، چستیِ ترکیب اور عام فہمی ہے۔ محاورے اور روزمرہ کی زبان کا استعمال ذوق نے اپنی غزلوں میں فنکارانہ انداز سے کیا ہے۔ ذوق نے زبان کو سجانے اور سنوارنے کا کام بھی انجام دیا۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

☆☆

کھل کے گُل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

11- مرزا اسداللہ خان غالبؔ

مرزا غالب سے اردو غزل کے ایک حسین باب کا آغاز ہوتا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی فکر کو نہ صرف پرواز عطا کی بلکہ اس میں زندگی کے مسائل کو بھی پیش کیا۔ ان کی شاعری کا دوسرا اہم پہلو شوخی اور ظرافت ہے اس لیے حالی نے انھیں حیوانِ ظریف کہا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تصوف، اخلاقی اور حکیمانہ خیالات بھی پیش کیے ہیں۔ انھیں حسن و عشق کی کیفیت کے اظہار میں قدرت حاصل تھی۔ غالب اردو زبان کا وہ شاعر ہے جس کے سر پر عظمت کا تاج رکھا گیا اور جب تک دنیا قائم ہے غالب کا نام اور کلام بھی زندہ رہے گا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

☆☆

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

12- حکیم مومن خان مومن

غالب کے ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ مقبولیت مومن کو ملی۔ مومن کی شاعری حسن و عشق اور محبت کے جذبے سے بھری پڑی ہے۔ معاملہ بندی، مضمون آفرینی، مکرِ شاعرانہ، جذبات نگاری، درد و تاثیر، بے ساختگی اور نازک خیالی ان کی شاعری کے نمایاں جوہر ہیں۔ مومن کا ایک مشہور شعر ہے :

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کہتے ہیں کہ غالب نے جب یہ شعر سنا تو کہا کہ مومن کے اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہوں۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

مذکورہ بالا شعرا اردو غزل کی تاریخ کے وہ اہم اور معتبر نام ہیں جنھوں نے غزل کے ارتقا میں نہ صرف نمایاں حصہ لیا بلکہ اسے سجانے، سنوارنے اور اس کے دامن کو وسعت عطا کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

4- ذوقؔ کو دربارِ دہلی سے کون سا خطاب ملا تھا؟

5- مرزا غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات بتائیے۔

6- مومن کے کس شعر پر غالب اپنا دیوان دینے کو تیار ہو گئے تھے؟

2.5 اردو نثر کا عہدِ زریں

جب ہم اردو ادب کے سنہرے دور کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں شعری اصناف نے زیادہ

ترقی کی اور نثر کا کام کم ہوا لیکن بنیادی طور پر نثر کے میدان میں بھی کچھ ایسے کارنامے انجام پائے جن سے اردو نثر کی ایک نئی اور روشن تاریخ کا آغاز ہوتا ہے اور یہ کام ان کالجوں کے توسط سے انجام پایا جنھوں نے اپنے قیام کے روزِ اول سے ہی اردو زبان وادب کی خدمت کا فریضہ انجام دینا طے کرلیا تھا۔ان میں فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس) ،دہلی کالج (دہلی) اور فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی خدمات اہم اور ناقابل فراموش ہیں۔

2.5.1 فورٹ سینٹ جارج کالج (قیام 1717ء)

1717ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد مدراس کے انگریز گورنر جوزف کالکٹ نے ڈالی۔اس کالج کو رائٹرس کالج بھی کہا جاتا تھا۔یہ کالج ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ پہلا ادارہ تھا جہاں منشیوں کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا تھا۔اس میں کئی شعبے تھے۔تعلیمی شعبہ،تصنیف وتالیف کا شعبہ،کالج کا مطبع اور شان دار کتب خانہ۔اس کالج کے قیام کا بنیادی مقصد کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا۔یہاں کا شعبۂ تعلیم دکنی، ہندوستانی، اردو، عربی، فارسی ،سنسکرت، تیلگو، ملیالم، تامل اور کنڑ زبانوں کے شعبہ جات پر مشتمل تھا۔اس کالج میں وکلا اور جج حضرات کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔اس کالج کی اردو مطبوعات ومخطوطات زیادہ تر دکنی زبان میں ہیں جن میں حکایت الجلیل، دکنی انوار سہیلی ،سنگھاسن بتیسی اور گلستاں کے نام اہم ہیں۔ان میں ''دکنی انوارِ سہیلی'' کو قدیم اردو کا آخری اہم نثری کارنامہ کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ یہاں صرف ونحو، لغت وقواعد، افسانہ، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔اس کالج کے مطبع میں پہلی بار 1791ء میں ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب ''ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد ولغت'' شائع ہوئی۔اس کے علاوہ دیگر انگریز مصنّفین میں تھامس روبک کی کتاب ''لغت جہاز رانی''، کیپٹن گرین اوے کی کتاب ''علی بابا چالیس چور''، ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کی کتاب ''اصولِ فنِ قبالت'' کا شمار بہترین علمی کارناموں کی حیثیت سے ہوتا ہے۔اس کالج کے ہندوستانی مصنّفین میں سے جن لوگوں نے زبان وادب کی خدمت کی ان میں تراب علی نامی کی کتاب ''خزینۃ الامثال''، سیّد حسن شاہ حقیقت کی کتاب ''جذبۂ عشق''، مہدی واصف کی کتاب ''حکایاتِ لطیفہ''، ابراہیم بیجاپوری کی کتاب ''دکنی انوارِ سہیلی''، منشی شمس الدین احمد کی کتاب ''حکایاتِ جلیلہ''،

منشی مظفر کی کتاب ''حیدر نامہ'' نے آسان اور عام فہم نثر نگاری کی روایت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس کالج نے نثر کے فروغ میں بلاشبہ اہم خدمات انجام دیں۔

2.5.2 فورٹ ولیم کالج (قیام 1800ء)

فورٹ ولیم کالج کا قیام 1800ء میں لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں عمل میں آیا۔ اس کالج کے قیام کا اصل مقصد انگریز افسران کو اردو زبان سے واقف کرانا تھا۔ کیوں کہ اس وقت یہی ایک ایسی زبان تھی جو پورے ملک میں ایک حصہ سے دوسرے حصے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس میں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو اردو کی مقبولیت کا احساس تھا اور وہ اپنے اقتدار کو مزید مستحکم بنائے رکھنے کے لیے یہ زبان سیکھنے پر مجبور تھے۔ ہر چند کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریزوں کی ایک سیاسی چال تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کالج سے جدید اردو نثر کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور جلد ہی آسان اور سہل اردو نثر کا چلن رائج ہو گیا۔ فورٹ ولیم کالج سے جو نثری کتابیں شائع ہوئیں ان کی زبان عام فہم اور رواں تھی۔ یہاں فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں لکھی گئی تقریباً 56 کتابوں کا سلیس اردو میں ترجمے کا کام انجام پایا۔ فورٹ ولیم کالج کا یہ کارنامہ اردو نثر کی تاریخ میں عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے خود بھی بہت سی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں جن میں ''انگریزی ہندوستانی لغت''، ''اردو کی صرف و نحو''، ''ہندوستانی علم اللسان'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس کالج کے منشیوں میں سب سے اہم نام میر امن دہلوی کا ہے جنھوں نے ''باغ و بہار'' جیسی کتاب لکھ کر اردو نثر کی تاریخ میں اپنی عظمت منوالی ہے۔ ''باغ و بہار'' کی مقبولیت کا اہم سبب اس کا اسلوب ہے جس میں ہمیں دلی کی ٹکسالی زبان کا لطف ملتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں جتنی شہرت میر امن کے حصے میں آئی، کسی دوسرے مصنف کو اتنی نہیں ملی۔ میر امن کے علاوہ یہاں جن نثر نگاروں نے اردو نثر کے فروغ میں حصہ لیا ان میں سیّد حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خان ولا، کاظم علی جواں، نہال چند لاہوری، للولال جی کوی اور بینی نارائن جہاں کے نام اہم ہیں۔

2.5.3 دہلی کالج (قیام 1825ء)

1792ء میں دلی میں اجمیری دروازے کے باہر ایک مدرسہ قائم کیا گیا جس کا نام نواب غازی الدین حیدر کا مدرسہ تھا۔ یہ مدرسہ نواب اعتماد الدولہ کی جانب سے ملنے والی رقم سے بنا تھا۔ اس مدرسے کے قیام کا دور وہ دور ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں تعلیم کی حالت بے حد ابتر تھی اور اس صورت حال کو مناسب بنانے نیز اس کے معیار کو قائم کرنے کے لیے دلی میں جے ٹیلر کی نگرانی میں جنرل تعلیمی کمیٹی نے تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا۔ مسٹر ٹیلر ہی کی ایما پر نواب غازی الدین حیدر کے مدرسے میں 1825ء میں ایک کالج قائم ہوا جو دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے پرنسپل جے ٹیلر بنائے گئے۔ کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ طلبا میں حصولِ علم کے لیے دلچسپی پیدا ہو اس کے لیے وظیفے بھی دیے گئے۔ 1828ء میں یہاں انگریزی کا شعبہ بھی قائم ہوا۔ 1857ء کے ہنگامے نے اس کالج کو بہت نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے سات برس تک یہاں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا کام بند رہا۔ مئی 1864ء میں کالج پھر سے کھل گیا اور اسے چاندنی چوک میں منتقل کر دیا گیا۔ 1868ء میں حکومت پنجاب کی جانب سے ایک حکم نامہ جاری کر کے اس کالج کو بند کر دیا گیا اور یہاں کے طلبا اور اساتذہ کو لاہور بھیج دیا گیا۔

دلی کالج شمالی ہند کا وہ پہلا ادارہ تھا جہاں مشرق ومغرب کے صحت مند عناصر موجود تھے۔ اس کالج کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ ریاضی، سائنس، نیچرل فلسفہ اور ہیئت کی تعلیم کا انتظام کر کے اردو زبان و ادب کی ایک شاندار روایت قائم کی۔ اس کالج کی اہم شخصیتوں میں ماسٹر رام چندر، بہاری لال آشوب، اسپرنگر، مملوک علی، شیونارائن آرام، مولوی کریم الدین، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور ضیاء الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

7- فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

8- ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب کا نام کیا ہے؟

9- فورٹ ولیم کالج کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

10- میر امن کی اس کتاب کا نام بتایئے جسے لازوال شہرت ملی۔

11- دلی کالج کا قیام کب اور کس کی ایما پر عمل میں آیا؟

12- دلی کالج سے وابستہ تین اہم شخصیتوں کے نام لکھیے۔

2.6 چند اہم نثر نگار

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ جس جدید اردو نثر کے رواج کا آغاز ہوا اس کا اثر پورے ملک پر پڑا اور اس طرح عام، سادہ، سلیس اور رواں نثر کا چلن شروع ہو گیا جس کی سب سے زندہ اور خوبصورت مثال ہمیں مرزا غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ مرزا غالب کے علاوہ جن نثر نگاروں نے اردو نثر کے فروغ میں حصہ لیا' ان میں فقیر محمد خان گویا ،رجب علی بیگ سرور، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور منشی سجاد حسین کے نام اہم ہیں۔

1- مرزا غالب

اردو نثر کے فروغ میں غالب کا نام بڑا اہم ہے۔ غالب عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ عظیم نثار بھی تھے جنھوں نے پہلی بار سیدھی سادی، عام فہم اور رواں دواں اردو میں خطوط نگاری کی روایت ڈالی۔ غالب کے یہ خطوط ''اردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔ یہ خطوط اردو نثر کا خوبصورت نمونہ ہی نہیں بلکہ اپنے دور کی سیاسی ،سماجی اور معاشی زندگی کا آئینہ بھی ہیں۔ اپنے خطوط کے ذریعہ غالب نے جدید اردو نثر کو ایک نیا رنگ و روپ عطا کیا۔

2- فقیر محمد گویا

فقیر محمد گویا لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے فارسی زبان کی مشہور کتاب ''انوارِ سہیلی'' کا اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام ''دبستانِ حکمت'' رکھا۔ اس کتاب کو بے حد مقبولیت ملی لیکن اس کی حیثیت ادبی کم اور تاریخی زیادہ رہی۔ گویا نے انوار سہیلی کا ترجمہ اس طرح کیا کہ اس پر اصل کا گمان ہونے لگا۔

3- رجب علی بیگ سرور

رجب علی بیگ سرور کا نام اردو ادب میں جس تصنیف کی وجہ سے لازوال شہرت کا سبب بنا وہ تصنیف ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ فسانۂ عجائب میں سرور نے اپنی بے پناہ نثری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں لکھنوی تہذیب وتمدن اور معاشرے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے اس دور کا لکھنؤ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ فسانۂ عجائب کا اسلوب مسجّع، مقفّیٰ اور مرصع ہے۔ فسانۂ عجائب کے حوالے سے سرور کو اردو ادب میں ہمیشہ امتیازی مقام حاصل رہے گا۔

4- پنڈت رتن ناتھ سرشار

اردو نثر کی تاریخ میں سرشار کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ انھیں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ سرشار کے تخلیقی سفر کا آغاز مختلف اخبارات میں مضامین کے ذریعہ ہوا۔ سرشار کی دوسری اہم خوبی یہ تھی کہ وہ ترجمہ نگاری کے فن پر قدرت رکھتے تھے۔ اسی بنا پر انھیں لکھنؤ کے مشہور ''اودھ اخبار'' کا مدیر بنایا گیا۔ ان کا اہم ادبی کارنامہ ''فسانۂ آزاد'' اسی اخبار میں قسط وار چھپتا تھا جو بعد میں 1880ء میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ سرشار کے یہاں زبان کی گھلاوٹ اور نکھرا ہوا اندازِ بیان ملتا ہے۔ سرشار کی دیگر تصانیف میں ''سیرِ کوہ سار''، ''جامِ سرشار''، ''خدائی فوج دار'' اور ''رنگیلے سیار'' اہم ہیں لیکن اردو ادب میں ان کا نام ''فسانۂ آزاد'' کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

5- عبدالحلیم شرر

شرر کے ادبی سفر کا آغاز کم عمری ہی میں ہوا یلن لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' میں ملازمت ملنے کے بعد ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ 1887ء میں شرر نے ''دل گداز'' کے نام سے اپنا رسالہ شائع کیا اور اسی میں متعدد قسط وار ناول لکھنے شروع کیے اور جلد ہی تاریخی ناول نگاری کی دنیا میں ان کا ایک منفرد مقام بن گیا۔ ان کا شہرۂ آفاق ناول ''فردوسِ بریں'' ہے۔ اس کے علاوہ فلورا فلورنڈا، حسن کا ڈاکو، منصور موہنا، زوالِ بغداد اور فتح ہسپانیہ ان کے اہم ناول ہیں۔

6- مرزا محمد ہادی رسوا

مرزا ہادی رسوا اردو کے ایک اہم ناول نگار ہیں۔ ''امراؤ جان ادا، شریف زادہ اور ذاتِ شریف'' ان کے مقبول ناول ہیں لیکن ان کی اصل شہرت ''امراؤ جان ادا'' سے ہوئی جس میں انھوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ کی زندگی کے شب و روز کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مرزا کی زبان صاف، سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ مرزا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک طوائف کی زندگی پر ایسا قصہ پیش کیا جس میں حقیقت کا گمان ہونے لگا۔ ان کا طرزِ تحریر خوش گوار اور دلکش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اس کے حسن میں کھو جاتا ہے۔

7- منشی سجاد حسین

اردو نثر کے فروغ میں منشی سجاد حسین کا نام اور ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے سیاست، معاشرت، تعلیم، ادب اور مذہب ہر طرح کے موضوعات پر مضامین لکھے۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی تاکہ عوام سے رشتہ برقرار رہے۔ ان کا مشہور ناول ''حاجی بغلول'' ہے۔ ان کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ''اودھ پنچ'' کے ذریعہ اردو کے بہت سارے شعرا و ادبا کو متعارف کرایا جنھوں نے اردو ادب کو عروج عطا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ، نواب سیّد محمد آزاد، اکبر الٰہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور چکبست کے نام اہم ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

13- مرزا غالب کے خطوط کے مجموعے کا نام بتائیے؟

14- فسانۂ عجائب کس کی تصنیف ہے؟

15- شرر کے دو تاریخی ناولوں کے نام لکھیے۔

2.7 خلاصہ

اردو ادب کے سنہرے دور کا عہد سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر پریشانیوں اور مصیبتوں کا عہد ہے۔ اس دور

میں مغل حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وقفے وقفے سے بادشاہ تبدیل ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس عہد میں اردو ادب کو بے حد فروغ ملا۔ اردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ کا عہد اردو شاعری کے عروج کا عہد ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں مظہرؔ جانِ جاناں، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے نام آتے ہیں۔ مرزا مظہرؔ یوں تو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن انھوں نے اردو میں بھی شاعری کی۔ میر کی شاعری کی نغمگی، سوز و گداز، دلکشی اور سلاست نے انھیں اردو کا عظیم غزل گو بنا دیا۔ انھیں خدائے سخن بھی کہا جاتا ہے۔ دردؔ بحیثیت صوفی شاعر مشہور ہیں کیوں کہ انھوں نے ابتدا ہی سے تصوف کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا۔ سوداؔ کا خاص میدان قصیدہ نگاری ہے لیکن غزل میں بھی ان کی اہمیت جگہ مسلم ہے۔ اس عہد کے ایک اور ممتاز شاعر انشاء اللہ خاں انشاء ہیں جنھوں نے غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ اور قطعہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ مصحفیؔ کے کلام میں جذباتیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ جرأتؔ کے کلام میں سوقیانہ جذبات اور ہوس پرستی و فحش گوئی کے عناصر ملتے ہیں۔ ناسخؔ نے شاعری سے زیادہ زبان و بیان کی اصلاح، قواعد اور فنِ شاعری پر زور دیا۔ آتشؔ نے اپنے کلام میں داخلی اور خارجی موضوعات کا اظہار سلیقے سے کیا ہے جس میں شوخی، رنگینی، روانی اور زبان کی سادگی کا حسن جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ذوقؔ کو اپنی قصیدہ گوئی کی بنیاد پر ''خاقانیِ ہند'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی فکر کو نہ صرف پرواز عطا کی بلکہ اس میں زندگی کے مسائل کو بھی پیش کیا۔ مومنؔ کی شاعری حسن و عشق اور محبت کے جذبے سے بھری پڑی ہے۔ معاملہ بندی، مضمون آفرینی، مکرِ شاعرانہ، جذبات نگاری، درد و تاثیر، بے ساختگی اور نازک خیالی ان کی شاعری کے نمایاں جوہر ہیں۔

اردو ادب کے اس سنہرے دور میں ہر چند کہ شعری اصناف نے زیادہ ترقی کی لیکن بنیادی طور پر نثر کے میدان میں بھی کچھ ایسے کارنامے انجام پائے جن سے اردو نثر کی ایک نئی اور روشن تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس)، دہلی کالج (دہلی) اور فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی خدمات اہم اور ناقابل فراموش ہیں۔ 1717ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد پڑی۔ اس کالج کے قیام کا بنیادی مقصد کمپنی کے

ملازمین کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا۔ اس کالج کے مطبع میں پہلی مار 1791ء میں ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب ''ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد ولغت'' شائع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام 1800ء میں لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں عمل میں آیا۔ اس کالج کے قیام کا اصل مقصد انگریز افسران کو اردو زبان سے واقف کرانا تھا۔ اس کالج سے جدید اردو نثر کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور جلد ہی آسان اور سہل اردو نثر کا چلن رائج ہوگیا۔ اس کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے ''انگریزی ہندوستانی لغت''، ''اردو کی صرف ونحو''، ''ہندوستانی علم اللسان'' جیسی اہم کتابیں ترتیب دیں۔ اس کالج کے منشیوں میں سب سے اہم نام میر امن دہلوی کا ہے جنھوں نے ''باغ و بہار'' جیسی کتاب لکھ کر اردو نثر کی تاریخ میں اپنی عظمت منوالی ہے۔ 1825ء میں نواب غازی الدین حیدر کے مدرسے واقع اجمیری دروازہ، دہلی میں ایک کالج قائم ہوا جو دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس کالج کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ ریاضی، سائنس، نیچرل فلسفہ اور ہیئت کی تعلیم کا انتظام کر کے اردو زبان وادب کی ایک شاندار روایت قائم کی۔

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ جس جدید اردو نثر کے رواج کا آغاز ہوا اس کا اثر پورے ملک پر پڑا اور اس طرح عام، سادہ، سلیس اور رواں نثر کا چلن شروع ہوگیا۔ اردو نثر کے فروغ میں بھی غالب کا نام بڑا اہم ہے۔ انھوں نے پہلی بار سیدھی سادی، عام فہم اور رواں دواں اردو میں خطوط نگاری کی روایت ڈالی۔ ''اردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' غالب کے خطوط کے مجموعہ ہیں۔ فقیر محمد خاں گویا نے فارسی زبان کی مشہور کتاب ''انوارِ سہیلی'' کا اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام ''دبستانِ حکمت'' رکھا۔ رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' میں لکھنوی تہذیب وتمدن اور معاشرے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب مسجّع، مقفّیٰ اور مرصع ہے۔ سرشار کے تخلیقی سفر کا آغاز مختلف اخبارات میں مضامین کے ذریعہ ہوا۔ ان کا اہم ادبی کارنامہ ''فسانۂ آزاد'' ہے۔ شرر نے تاریخی ناول نگاری کی دنیا میں ایک منفرد مقام بنایا۔ ان کا شہرۂ آفاق ناول ''فردوسِ بریں'' ہے۔ مرزا ہادی رسوا کی اصل شہرت ''امراؤ جان ادا'' سے ہوئی جس میں انھوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ کی زندگی کے شب وروز کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ منشی سجاد حسین کا

مشہور ناول ''حاجی بغلول'' ہے۔اس طرح یہ پورا دور اردو ادب کا سنہرا دور قرار پاتا ہے۔

2.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1- اردو ادب کے سنہرے دور کا پس منظر بیان کیجیے۔

2- میرؔ اور غالبؔ کی شاعری پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

3- دلی کالج کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1- اردو شاعری کے سنہرے دور پر روشنی ڈالیے۔

2- اردو کے چند اہم نثر نگاروں کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3- فورٹ سینٹ جارج کالج اور فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں کو بیان کیجیے۔

2.9 فرہنگ

پرآشوب : پریشانی اور مصیبتوں سے بھرا ہوا

نامساعد : ناسازگار، حالات موافق نہ ہونا

تخت نشینی : بادشاہ بننا، تختِ سلطنت پر بیٹھنا

فتح یاب : فتح حاصل کرنا

عروج : بلندی

آپ بیتی : اپنی کہانی یا اپنا حال بیان کرنا

جگ بیتی : زمانے کے حالات بیان کرنا

خدائے سخن : شاعری کا خدا، استادِ سخن

مقفّیٰ : قافیہ کیا گیا- قافیہ دار

مرصع : خوش بیانی سے آراستہ، وہ نثر یا نظم جس میں ہر لفظ کے برابر میں دوسرا لفظ اسی وزن یا قافیے کا ہو۔

مسجع : وہ عبارت یا مضمون جس میں قافیے کا اہتمام ہو۔ قافیہ دار عبارت

خاقانیِ ہند : خاقانی فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کی قصیدہ نگاری سے متاثر ہو کر انھیں ہندوستان کا خاقانی کہا۔

تشبیہات : مشابہت دینا

مصلح : اصلاح کرنے والا

اجل : موت

معاملہ بندی : بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا

فحش گوئی : بیہودہ باتیں کرنا

تکلف : تکلف اٹھا کر کوئی کام کرنا۔ بناوٹ، آرائش

ظرافت : خوش طبعی، تمسخر، مذاق

توسط : ذریعہ، وسیلہ

2.10 معاون کتب

1- ڈاکٹر اعجاز حسین — مختصر تاریخِ ادب اردو

2- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — دلّی کا دبستانِ شاعری

3- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

4- ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ — اردو نثر کا آغاز و ارتقا

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

-1 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی۔

-2 اب خرابہ ہوا جہاں آباد ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

-3 بہادر شاہ ظفر کی وفات 1862ء میں رنگون میں ہوئی۔

-4 ذوق کو دربارِ دہلی سے ''خاقانیِ ہند'' کا خطاب ملا تھا۔

-5 غالب کی غزلوں کی خصوصیات میں شوخی، ظرافت، صوفیانہ رنگ، اخلاق اور حکیمانہ مضامین وغیرہ ہیں۔

-6 تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

-7 فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام 1717ء میں مدراس میں عمل میں آیا۔

-8 ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب کا نام ''ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد ولغت'' ہے۔

-9 فورٹ ولیم کالج کا قیام 1800ء میں لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں کلکتہ میں عمل میں آیا۔

-10 میر امن کی اس کتاب کا نام ''باغ و بہار'' ہے۔

-11 دلی کالج کا قیام 1825ء میں جے ٹیلر کی ایما پر عمل میں آیا۔

-12 دلی کالج سے وابستہ تین اہم شخصیتوں میں مولوی کریم الدین، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔

-13 مرزا غالب کے خطوط کے مجموعوں کا نام ''عودِ ہندی'' اور ''اردوئے معلیٰ'' ہے۔

-14 ''فسانۂ عجائب'' رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ہے۔

-15 ''فردوسِ بریں'' اور ''زوالِ بغداد'' شرر کے تاریخی ناولوں کے نام ہیں۔

اکائی 3 : اردو ادب کا عہدِ جدید

ساخت

3.1 اغراض و مقاصد

3.2 تمہید

3.3 پس منظر

3.4 عہدِ سرسیّد میں اردو نثر

3.5 عہدِ سرسیّد میں اردو شاعری

3.6 انجمن پنجاب کی تحریک

3.7 اقبال کا عہد اور ان کے معاصرین

3.8 خلاصہ

3.9 نمونۂ امتحانی سوالات

3.10 فرہنگ

3.11 معاون کتابیں

3.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

3.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں اردو ادب کے عہد جدید پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا جائے گا کہ 1857ء کے بعد عمل اور ردِ عمل کی جو صورتِ حال تھی اسے سرسیّد اور ان کے رفقا نے کس طرح سے پرسکون بنایا نیز اردو ادب کو نئی سوچ، نئی فکر، نیا خیال اور اظہار کا نیا انداز عطا کیا۔ اردو ادب کے عہد جدید

میں علامہ اقبال کی کوششیں اور مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات کے کیا اثرات رہے' اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جس کے مطالعہ سے آپ یہ جان جائیں گے کہ اردو ادب کے عہدِ جدید میں کس طرح تبدیلیاں ہوئیں اور اردو ادب نے کس طرح ترقی کی راہیں طے کیں۔

3.2 تمہید

اردو ادب میں عہدِ جدید کا آغاز 1857ء کی بغاوت سے ہوا جسے ہم پہلی جنگ آزادی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ہر چند کہ اس میں آزادی کے متوالوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس صورت حال نے اردو کے شعرا و ادبا کو بیدار کر دیا اور ان کے فکر و عمل میں تبدیلی آنے لگی جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب کا عہدِ جدید شروع ہو گیا۔ سر سیّد احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال نے نئی روشنی اور نئے راستے دکھائے جس سے اردو نثر اور شعری ادب میں نکھار آیا نیز اردو ادب نے مغربی اثرات بھی قبول کئے۔ خاص طور پر اردو کے نثری ادب پر انگریزی کے نثری ادب اور یورپ کی دوسری زبانوں کی نثری ادبیات کا بھی انگریزی زبان کے توسط سے گہرا اثر پڑا۔ اردو میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی روایت کے ابتدائی نقوش مغرب کے گہرے اثرات کا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ انشائیہ' سوانح' رپورتاژ وغیرہ جیسی نثری اصناف انگریزی زبان و ادب کے اثر کا ہی نتیجہ ہیں۔ شاعری میں البتہ موضوعات کے نقطۂ نظر سے تبدیلی آئی لیکن فارم کے لحاظ سے جدید نظم کے علاوہ مغرب کی دوسری اصناف شعر کا اثر اردو شاعری پر کم پڑا۔

3.3 پس منظر

1857ء کا سال تاریخِ ہند میں بڑا اہم اور انقلابی مانا جاتا ہے کیوں کہ اسی سال پہلی جنگ آزادی کی آواز بلند کی گئی جسے مختصر طور پر ناکامی تو ضرور ملی لیکن اس کے ردِ عمل سے ہندوستانی سماج کے ہر شعبے میں تبدیلی آنے لگی۔ انگریزوں نے آزادی کے جذبے سے سرشار وطن پرستوں اور قلم کاروں کا قتل کرنا شروع کر دیا یا انھیں سرزمینِ ہند سے

جلاوطن کرنے لگے۔ اہل قلم حضرات نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ نئے اور بدلے ہوئے حالات کو سمجھیں اور ترقی کی جانب قدم بڑھائیں۔ انھوں نے اپنے محاسبے پر بھی زور دیا تا کہ ہندوستانی عوام جان پائیں کہ ان کے اندر وہ کون سی کمزوریاں اور خرابیاں در آئی ہیں جن کی وجہ سے انگریز ان پر حاوی ہو گئے ہیں۔ جب اس تلخ حقیقت سے ہندوستانی عوام واقف ہوئے تو ان کے اندر اصلاح کا جذبہ بھی بیدار ہوا۔ جس نے زندگی کے ہر شعبے میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ سماجی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی، اخلاقی اور تعلیمی شعبے میں بھی خوش گوار انقلاب آئے۔ اس عہد میں بحیثیت مصلح جس شخص نے قوم کی زبوں حالی دور کرنے کا بیڑا اپنے سر اٹھایا وہ سرسیّد احمد خان کی ذات تھی۔ سرسیّد نے اصلاح کی جو تحریک شروع کی اسے سرسیّد تحریک اور علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔ سرسیّد اس دور کے سب سے بڑے دانشور اور قلم کار تھے۔ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ اردو کے شعرا و ادبا کو نئی روشنی دکھائی تا کہ وہ اپنی سوچ و فکر میں تبدیلی لا سکیں۔ سرسیّد نے ان کے اندر مغربی علوم و زبانیں سیکھنے کے لئے بھی دلچسپی پیدا کی کیوں کہ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ ہمارے زوال کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم علوم و فنون سے دور ہو گئے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے حصولِ علم کی جانب سب سے پہلے توجہ دی اور مغربی علوم سیکھنے پر بھی زور دیا۔ چوں کہ انھیں علوم کی بدولت مغربی ممالک دنیا میں چھائے ہوئے تھے۔ سرسیّد نے جہاں مذہبی، سماجی، تہذیبی معاشی اور تعلیمی زندگی میں تبدیلی پیدا کی وہیں اردو زبان و ادب کی بھی اصلاح کا کام کیا۔ اس لئے کہ وہ اردو زبان کے وسیلے سے اپنی بات دوسروں تک پہنچا رہے تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

1- پہلی جنگ آزادی کی آواز کب بلند ہوئی؟

2- سرسیّد کی اصلاحی تحریک کا کیا نام پڑا؟

3- 1857ء کی جنگ آزادی کا ردعمل کیا ہوا؟

3.4 عہدِ سرسیّد میں اردو نثر

سرسیّد کا عہد اردو ادب کا ایک اہم دور ہے جس میں نثر اور شاعری کی نہ صرف ترقی ہوئی بلکہ اسے جدید روشنی بھی ملی کیوں کہ سرسیّد کے زمانے تک اردو ادب محدود موضوعات کی گھیرابندی میں قید تھا۔ یہ موضوعات قصہ کہانی، حسن وعشق اور گل وبلبل کے ذکر سے بھرے پڑے تھے۔ ادب حقیقت نگاری سے دور تھا۔ سرسیّد نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ ادب کو حقیقت سے قریب کیا جائے۔ تکلف اور تصنع کی زبان سے ہٹ کر انھوں نے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی اور اپنے رفقا میں بھی یہ رجحان پیدا کیا جس کا خوش گوار اثر اردو ادب پر پڑا اور اس میں ہر قسم کے موضوعات جگہ پانے لگے۔ سرسیّد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قدیم اندازِ تحریر کو ترک کر کے نیا اندازِ تحریر نہ صرف خود اختیار کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس جانب راغب کیا۔ سرسیّد نے ایسے موضوعات پر لکھا جو اس سے قبل اردو ادب میں نہیں لکھے گئے تھے۔ سرسیّد کی پہلی کتاب ''آثار الصنادید'' ہے جس میں انھوں نے دلّی کی قدیم عمارتوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ سرسیّد نے سائنٹفک سوسائٹی اور اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ بے شمار مضامین لکھ کر اردو ادب کے دامن کو وسعت عطا کی۔ ان کا ایک بڑا اور قابل قدر کارنامہ ''خطباتِ احمدیہ'' ہے جس میں انھوں نے انگریز مصنف ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد ﷺ'' کا جواب دیا ہے۔ سرسیّد نے سیاسی موضوعات پر بھی خوب لکھا اور اس کے لیے وہی طرزِ تحریر اختیار کیا جو ان کے لیے مناسب تھا۔ اس سلسلے میں ان کا رسالہ ''اسبابِ بغاوت ہند'' اہم ہے۔ سرسیّد نے قرآنِ پاک اور انجیل کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی۔ ان میں سرسیّد نے تحقیقی انداز اختیار کیا۔ سرسیّد کو اپنی بات مدلل انداز میں پیش کرنے پر مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے خالص ادبی نثر کے نمونے اپنے انشائیوں میں پیش کیے جن میں خوشامد، رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات، ریا اور امید کی خوشی اہم ہیں۔ آج اردو نثر کی جو شاندار عمارت ہم دیکھ رہے ہیں، اس کی بنیاد دراصل سرسیّد نے ہی ڈالی تھی۔

سرسیّد نے اردو ادب کو جدید روشنی سے منور کرتے ہوئے نہ صرف اپنے مضامین کے ذریعے ایک نئی راہ دکھائی بلکہ اپنے رفقا کے ذریعہ ایک ایسا کارواں بھی تیار کیا جس نے اردو ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان

لوگوں کی ان ہی خدمات کے تحت انھیں جدید اردو ادب کے عناصر خمسہ کے نام سے پکارا گیا جو سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد پر مشتمل ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

سرسیّد کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے حالی نے اردو ادب کی ترقی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ حالی اعلیٰ درجے کے شاعر، بہترین انشاء پرداز، نقاد اور باکمال سوانح نگار بھی تھے۔ مقدمۂ شعر وشاعری ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے اردو میں جدید تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ حالی کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فنِ سوانح نگاری کو عروج پر پہنچادیا۔ حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی ان کی بہترین سوانح عمریاں ہیں۔ حالی نے اردو نثر کو ایک نئی شان عطا کی۔ حالی کی خوبی یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو سادہ اور سلیس انداز میں اس طرح بیان کردیتے ہیں کہ بات فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی

سرسیّد کے رفقا میں حالی کے بعد شبلی نعمانی نے اردو نثر کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ انھوں نے سوانح نگاری، تاریخ اور تنقید کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی عظیم الشان سوانح عمری ''سیرت النبی ﷺ'' ہے جس میں حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مفصل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''الفاروق، سیرت النعمان، الغزالی اور المامون'' جیسی سوانح عمریاں بھی تصنیف کیں۔ تنقید کے میدان میں ان کا اہم کارنامہ ''شعرالعجم'' اور ''موازنۂ انیس و دبیر'' ہے۔ انھوں نے ''الندوۃ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں مذہبی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھ کر اردو صحافت کو ایک وقار عطا کیا۔ مقالاتِ شبلی کے نام سے ان کے مضامین کے کئی مجموعے بھی ملتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ''مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ ابتلا، ایامیٰ اور رویائے صادقہ'' ان کے اہم ناول ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے جو 1869ء میں لکھا گیا۔ اپنے

ناولوں کے ذریعہ نذیر احمد نے سماجی مسائل کی اصلاح کی کامیاب کوششیں انجام دیں۔ صنف ناول کو اردو ادب میں رواج دے کر انھوں نے اردو نثر کا دامن وسیع کیا۔ نذیر احمد کا اسلوب سادہ، رواں، برجستہ اور بے ساختہ ہے۔ بامحاورہ نثر قلم بند کرنے پر انھیں مہارت تھی۔ انھوں نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایسی کتابیں بھی لکھیں جو خواتین کے لئے مفید تھیں۔ ناول کے علاوہ نذیر احمد نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور تفسیر بھی لکھی۔ یہ ترجمہ سادہ، سلیس اور بامحاورہ زبان میں کیا گیا۔

محمد حسین آزاد

سرسیّد کے اہم رفقا میں ایک بڑا نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ آزاد کی تصانیف میں ''آبِ حیات، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ''آبِ حیات'' کی اہمیت نہ صرف اس کے اسلوب کی وجہ سے ہے بلکہ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اسے سب سے پہلے اردو زبان کی تاریخ کا امتیاز حاصل ہے۔ آزاد نے تصانیف کے ذریعہ اردو نثر کو بانکپن اور وقار عطا کیا۔ ان کا اسلوب دلکش اور منور ہے۔

اس مختصر جائزے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اردو نثر کی تعمیر اور اس کے فروغ وارتقا میں سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے نام نہایت اہم ہیں۔ آج اردو نثر جس مقام پر ہے وہ انھیں محسنینِ ادب کی گراں مایہ خدمات کا ثمرہ ہے۔

اپنے مطالعہ کی جانچ کیجیے۔

4- سرسیّد کی کتاب ''آثار الصنادید'' کیا ہے؟

5- اردو کے پہلے ناول کا نام بتایئے۔

6- اردو ادب کے عناصر خمسہ کون ہیں؟

3.5 عہدِ سرسیّد میں اردو شاعری

سرسیّد تحریک کا اثر نثر نگاری کے علاوہ شاعری پر بھی پڑا جس نے شاعری میں انقلاب آفریں تغیر پیدا کر کے

نئی شاعری کی راہیں ہموار کیں۔ سرسیّد نے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح کا کام کیا وہیں شعروادب میں بھی تبدیلی لانے کی کوششیں کیں۔ شاعری کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ ہمیں قدیم انداز ترک کر کے نئے انداز کو تسلیم کرنا چاہیے۔ سرسیّد کے ان خیالات کو حالی نے عملی شکل عطا کی۔ حالی نے سرسیّد کی ایما پر مسدس کی شکل میں اپنی شاہ کار نظم ''مدوجزرِ اسلام'' لکھی۔ یہ اردو کی پہلی نظم ہے جس میں مسلمانوں کے عروج وزوال کو بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس نظم سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ سرسیّد نے اس نظم کے حوالے سے کہا تھا کہ ''خدا اگر مجھ سے یہ سوال کرے کہ میں نے دنیا میں کون سا اچھا کام کیا ہے؟'' تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے مدوجزر اسلام لکھوایا ہے۔ حالی نے اس کے علاوہ ملکی، قومی اور دیگر موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھیں جنھوں نے بعد کے شعرا کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جدید اردو شاعری کی بنیاد رکھی اور اس کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

اردو شاعری کو جدید رنگ وروپ دینے میں آزاد کی اہم خدمات رہی ہیں۔ آزاد انجمن پنجاب کے روحِ رواں تھے اور وہ اس کے جلسوں میں شعرا کو مختلف موضوعات پر نظم لکھ کر لانے کو کہتے اور اس طرح انھوں نے غزل کے مقابلے میں نظم کے فروغ کی کامیاب کوشش کی۔ وہ خود بھی انجمن پنجاب کے جلسے میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ اپنی موضوعاتی نظمیں بھی سناتے تھے۔ انھوں نے مثنوی کی ہیئت میں کئی نظمیں لکھیں اور اردو کی نظمیہ شاعری میں توسیع کی عملی کوشش کی۔

شبلی نعمانی کا شمار سرسیّد کے اہم رفقا میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں جن میں اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں مثنوی، مسدس، مرثیہ، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی اور نظمیں شامل ہیں۔

حالی کے ہم عصروں میں ایک اہم نام اسماعیل میرٹھی کا بھی ہے۔ یوں تو انھیں بچوں کے شاعر کی حیثیت سے شہرت ملی لیکن انھوں نے باشعور قارئین کے لیے سنجیدہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے اپنی نظموں کے ذریعہ

اپنے عہد کے حالات کو پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں مشرقی تہذیب کا وقار ملتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے شعری سفر کا آغاز قدیم طرز کی شاعری سے کیا تھا لیکن جلد ہی وہ جدید طرز کی نظمیں لکھنے لگے۔ اسی لیے انھیں ''لسان العصر'' کا خطاب ملا۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرزِ زندگی پر بھرپور طنز کیے۔ ان کا کلام طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ اکبر نے مغربی تہذیب کی اندھی پیروی سے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی۔

عہدِ سرسید میں نظم نگاری کے علاوہ غزل میں بھی جدید انداز اختیار کیا گیا۔ اس سلسلے میں حالی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے غزل کو حسن و عشق کے موضوعات سے باہر نکال کر اس میں ہر طرح کے مضامین بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں غزل کی اصلاح کے حوالے سے اہم مشورے دیے۔ حالی کے علاوہ منشی امیر احمد مینائی نے غزل کے گیسو سنوارنے کا کام انجام دیا اور اپنی غزل گوئی کی بنا پر اس قدر مشہور ہوئے کہ واجد علی شاہ نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا۔ ان کی غزلوں کے دو دواوین ''مراۃ الغیب'' اور ''صنم خانۂ عشق'' موجود ہیں۔ امیر مینائی کے اشعار میں شگفتگی، شیرینی اور بلا کی سادگی پائی جاتی ہے۔

داغ دہلوی اپنے زمانے کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات زبان کی صفائی، سلاست و روانی، شیرینی و بلاغت، بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کی دل کشی ہے۔ انھوں نے ''فریادِ داغ'' کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے شعری سرمائے میں قصائد، قطعات، شہر آشوب اور رباعیات بھی ہیں۔ داغ کا اردو شاعری کو سب سے بڑا تحفہ یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے ذریعہ زبان کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے اس کے معیار کو وقار بخشا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ سرسیّد میں نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی فروغ ملا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

7- ''مدوجزرِ اسلام'' کے حوالے سے سرسیّد نے کیا کہا؟

8- داغ کی شاعرانہ خصوصیات بیان کیجیے۔

9- ''صنم خانۂ عشق'' کس کا شعری مجموعہ ہے؟

3.6 انجمن پنجاب کی تحریک

جدید اردو ادب کے حوالے سے جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ اردو شاعری پر اس عہد کے اثرات کس طرح مرتب ہوئے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ 21 جنوری 1865ء کو جب لاہور میں انجمنِ پنجاب کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پرچم تلے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا اور اس قابلِ تحسین کام کے محرک کرنل ہالرائڈ' ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، پنجاب تھے اور اس تنظیم کے بندوبست کا سہرا گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کے سر رہا۔ آپ ایک ایسے صاحبِ بصیرت مفکر تھے جنھیں علومِ شرقیہ کی بقا سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس انجمن کے ذریعے محمد حسین آزاد نے اس روایت کا آغاز کیا کہ طرحی مشاعروں کی بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھی جائیں۔ ہر مشاعرے کے لیے ایک خاص موضوع پہلے سے طے کر دیا جاتا تھا اور مشاعرہ پڑھنے والے شعرا اس موضوع کے حوالے سے مسلسل نظمیں کہتے تھے۔ آزاد نے خود بھی موضوعاتی نظمیں ان مشاعروں میں سنائیں۔ اس روایت کے آغاز کا یہ مثبت پہلو سامنے آیا کہ اردو میں نظم نگاری کی فضا بے حد سازگار ہوگئی۔ انجمن کا پہلا مشاعرہ 30 مئی 1874ء کو ''برسات'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس کے علاوہ ''زمستان، امید، حبِ وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت'' اور ''تہذیب'' وغیرہ اس انجمن کے تحت منعقد ہونے والے مشاعروں کے دیگر موضوعات تھے۔ موضوعاتی مشاعروں کے علاوہ یہاں مختلف مضامین پر بحث و مباحثے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جو بے حد مقبول ہوا۔ ان جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث کی اجازت نے اردو ادب میں صحت مند تنقید کو فروغ دیا جس سے ادب کو فائدہ پہنچا۔

انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جدید طرز کے کل 10 مشاعرے ہوئے اور ان مشاعروں میں محمد حسین آزاد برابر شریک رہے جب کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے صرف 4 مشاعروں میں اپنا کلام پیش کیا۔ سیاسی اور سماجی نظام کی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے آزاد اور حالی نے اس بات کو بخوبی محسوس کیا تھا کہ شاعری میں پرانے اور فرسودہ مضامین کو دہرانے کی بجائے نئے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جائے۔ انجمن پنجاب کے قیام کے اغراض و مقاصد درج ذیل تھے۔

1- قدیم مشرقی علوم کا احیا

2- صنعت وتجارت کا فروغ

3- باشندگانِ ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علومِ مفیدہ کی اشاعت

4- علمی وادبی، معاشرتی وسیاسی مسائل پر بحث ونظر

5- صوبے کے بارسوخ اہلِ علم طبقات اور افسرانِ حکومت میں رابطہ

6- پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری

انجمن پنجاب کے ان مقاصد کو فروغ دینے کے لئے مدرسے اور کتب خانے قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تا کہ اس کا پیغام دوسری ریاستوں تک پہنچایا جا سکے اس کے لیے مختلف سماجی، تہذیبی، اخلاقی، تعلیمی اور ادبی موضوعات پر مضامین پڑھنے اور ان پر بحث ومباحثے کے لیے ادبی نشستوں کا بھی اہتمام کیا گیا نیز رسائل جاری کرنے کا فیصلہ بھی لیا گیا۔ یوں تو انجمن کے مشاعروں میں بہت سے شعرا نے شرکت کی لیکن حالی اور آزاد کو بے پناہ شہرت ملی۔ انجمن پنجاب کی تحریک مبالغہ آرائی، تصنع، بناوٹ، بے جا لفاظی اور آرائش کی مخالفت میں پہلی باضابطہ فعال تحریک تھی جس کے مثبت اثرات سامنے آئے اور اردو میں نظم نگاری کا رجحان فروغ پانے لگا۔ انجمن پنجاب کا آخری مشاعرہ 13 مارچ 1875ء کو ہوا اور اس کا موضوع تہذیب تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10- انجمن پنجاب کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

11- انجمن پنجاب کے زیر اہتمام کتنے مشاعرے منعقد ہوئے؟

12- انجمن پنجاب کا آخری مشاعرہ کب ہوا اور اس کا موضوع کیا تھا؟

3.7 اقبال کا عہد اور ان کے معاصرین

اقبال اور ان کے معاصرین کا دور دنیا کی تاریخ میں سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور ذہنی انقلابات کا دور ہے۔ اس دور کا اردو ادب بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ علمی اور سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی تباہی سے پوری دنیا جس طرح متاثر ہوئی تھی اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ دنیا کی اس صورتِ حال کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا جہاں وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے ہر ہندوستانی اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے ملک میں مختلف تحریکیں بھی چل رہی تھیں مثلاً خلافت تحریک، ترکِ موالات کی تحریک، سول نافرمانی تحریک اور ہندوستان چھوڑو تحریک۔ انگریز ان تحریکوں کو کچلنے کی سازش رچا رہے تھے جس کے لیے انھوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی خطرناک پالیسی اختیار کی۔ ان کی یہ پالیسی ہندو مسلم فسادات اور ہندوستان کی تقسیم کا سبب بنی۔

اقبال کا عہد اردو ادب کی تاریخ میں اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ عہد مختلف ادبی رجحانات اور تحریکوں کا عہد رہا ہے۔ اس عہد میں جہاں 1914ء تک محمد حسین آزاد اور حالی کا جدید رنگ نمایاں اور مقبول تھا تو وہیں امیرؔ اور داغؔ قدیم طرز کی شاعری کر رہے تھے۔ ایک طرف ''ادبِ لطیف'' کی تحریک میں رومانیت، حسن پرستی اور ادب برائے ادب کی باتیں بیان کی جا رہی تھیں تو وہیں دوسری طرف پریم چند اور دیگر قلم کار حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کا فلسفہ پیش کر رہے تھے۔ ''ترقی پسند تحریک'' اور ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے رجحانات کے اثرات بھی اس دور میں ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس عہد کے اردو ادب میں جہاں باغیانہ اور انقلابی رجحانات ملتے ہیں، وہیں روایتی انداز بھی نظر آتا ہے۔ اس عہد میں اقبال ایک قد آور دانشور کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان تمام رجحانات اور تحریکوں کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے عہد کو عہدِ اقبال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال کا شمار اردو کے ان عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے جنھوں نے بیک وقت نظم اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے انمٹ نقوش قائم کیے۔ اقبال نے ابتدا میں داغؔ دہلوی

سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور داغؔ کے انداز میں غزلیں بھی کہیں لیکن بہت جلد ان کا اپنا رنگِ سخن ابھر آیا۔ اقبال کے کلام میں وطن پرستی، فکر و فلسفہ، جستجو اور تجسس، عظمتِ آدم کا تصور اور فلسفۂ حیات کے عناصر ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے تین بنیادی عناصر ہیں' خودی، عشق اور عمل۔ اردو میں اقبال کے تین شعری مجموعے ہیں بانگِ درا، بالِ جبرئیل اور ضربِ کلیم ہیں۔

اقبال کے ہم عصر شعرا

اقبال کے ہم عصر شعرا جنھوں نے اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا اور شاعری کو جدید خیالات و افکار سے روشناس کرانے کی اہم کوششیں کیں' ان میں ظفر علی خاں، چکبست لکھنوی، سرور جہاں آبادی، عظمت اللہ خاں، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی، ریاض خیرآبادی، آرزو لکھنوی، جلیل مانک پوری اور فراق گورکھ پوری کے نام اہم ہیں۔

ظفر علی خاں شاعر کے علاوہ صحافی اور نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نظموں کے موضوعات سیاسی ہیں۔ چکبست لکھنوی نے ملک کی آزادی کے حوالے سے پر جوش اور اثر انگیز نظمیں لکھیں۔ چکبست کی حیثیت نقاد کی بھی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ سرور جہان آبادی کی شاعری جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہے۔ انھوں نے تاریخی اور مذہبی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ عظمت اللہ خاں کو اردو کا باغی شاعر کہا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے روایت پرستی کی بجائے روایت شکنی کا راستہ اختیار کیا۔ عظمت بہترین انشائیہ نگار بھی تھے۔ جوش ملیح آبادی کو الفاظ کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم و ملک کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ اسی بنا پر انھیں ''شاعرِ انقلاب'' بھی کہا جاتا ہے۔ جوش نے سیاسی موضوعات کے علاوہ حسن و شباب کے حوالے سے بھی نظمیں لکھیں اور ''شاعرِ شباب'' کہلائے۔ حسرت موہانی نے غزل کے میدان میں نئے تجربات کرتے ہوئے محبوب کا ایک انوکھا اور دل کش تصور اردو شاعری کو دیا اور اردو غزل کو معنوی اور صوری دونوں سطح پر تازگی اور توانائی عطا کی۔ فانی بدایونی نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے غزل میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا۔ زندگی کی ناپائیداری، جبر اور

بے سمتی کے تجربے نے ان کی شاعری کو المیہ احساس سے پر کر دیا۔ اصغر گونڈوی کی شاعری کا رنگ سب سے الگ ہے۔ انھوں نے حسن و عشق کی نئی کیفیات سے اردو غزل کو روشناس کرایا۔ یگانہ چنگیزی اپنی طرز کے منفرد اور اہم شاعر ہیں۔ ان کی آواز اردو شاعری میں ایک نئے لب و لہجے کے ساتھ ابھری جس میں سرکشی اور روایت شکنی کا جذبہ زیادہ ملتا ہے۔ جگر مرادآبادی نے اپنی صلاحیتوں سے اردو غزل کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انھوں نے غزلوں میں جدائی کے شکوے سے زیادہ فراق میں گذرنے والی کیفیتوں کا اظہار پیش کیا۔ ریاض خیرآبادی نے اپنی غزلوں میں شراب کے مضامین اس خوب صورتی سے باندھے کہ خود کوئی مے خوار شاعر بھی اس کا اظہار اس طرح نہ کر پائے گا جب کہ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے کبھی شراب کو چھوا بھی نہیں۔ آرزو لکھنوی کا شمار ممتاز غزل گو کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آپ لکھنؤ کے استاد شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جلیل مانک پوری کی شاعری پر داغ کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ فراق گورکھ پوری نے اردو غزل کو ایک خاص رنگ و آہنگ عطا کیا اور ان کی یہی خوبی انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اقبال کے ہم عصر نثر نگار

عہدِ اقبال اردو نثر کے حوالے سے بھی اہم مانا جاتا ہے۔ اس عہد میں سادہ اور عام نثر کا چلن رائج ہو چکا تھا۔ ترجمے کی شکل میں مغربی علوم اردو ادب کا دامن وسیع کر رہے تھے۔ افسانوی، غیر افسانوی، صحافتی، علمی نثر کے علاوہ مذاحیہ اور طنزیہ نثر کو بھی فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اقبال کی نثر نگاری ان کے خطوط کے حوالے سے ادبی منظر نامے پر آئی جس میں صحافت اور روداد نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اقبال کی نثر کو غیر افسانوی نثر کا درجہ حاصل تھا۔ اس بنا پر انھیں غیر افسانوی نثر کا نمائندہ بھی کہا جاتا ہے۔ عہدِ اقبال میں جہاں علمی نثر کو فروغ ملا وہیں ادبی نثر کا منظر نامہ بھی تبدیل ہوا ۔ناول، ڈراما، افسانہ، ناولٹ، افسانچہ، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، خودنوشت، آپ بیتی، روزنامچہ نویسی، سفرنامے، رپورتاژ، خاکہ نگاری، تحقیق، تنقید، صحافت اور مکتوب نگاری کی روایت بھی مستحکم ہوئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر لحاظ سے یہ عہد اردو ادب کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عہد میں ناول کے فن کو فروغ دینے والوں میں عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور منشی پریم چند کے نام

نہایت اہم ہیں جب کہ صنفِ افسانہ نگاری کو ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کرنے کے لیے پریم چند کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، علی عباس حسینی کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔ ڈراما نگاری کے میدان میں آغا حشر کاشمیری، حکیم احمد شجاع اور امتیاز علی تاج نے اس فن کے فروغ کے لیے اہم کارنامے انجام دیے۔ نیاز فتح پوری، مہدی افادی، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، برج موہن دتاتریہ کیفی اور سیّد سلیمان ندوی نے فنِ صحافت کے فروغ میں حصہ لے کر اسے ایک معیار عطا کیا۔ طنز و مزاح کے حوالے سے جو نام منظرِ عام پر آئے اور اس صنف کی آبیاری کا فریضہ انجام دیا ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی کے نام اہم ہیں۔ اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ عہدِ اقبال میں شاعری کے ساتھ ساتھ جدید اردو نثر کی ترقی کا کام بھی منظم طریقے سے انجام پایا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

13- عہدِ اقبال میں ملک کی آزادی کے لیے کون سی تحریکیں چل رہی تھیں؟

14- اردو میں اقبال کے شعری مجموعے کتنے ہیں؟ ان کے نام لکھیے۔

15- اقبال کے ہم عصر شعرا میں سے کسی تین کے نام بتائیے۔

3.8 خلاصہ

اردو ادب میں عہدِ جدید کا آغاز 1857ء کی بغاوت سے ہوا۔ سرسیّد احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال نے نئی روشنی اور نئے راستے دکھائے جس سے اردو نثر اور شعری ادب میں نکھار آیا نیز اردو ادب نے مغربی اثرات بھی قبول کیے۔ اس عہد میں بحیثیت مصلح جس شخص نے قوم کی زبوں حالی دور کرنے کا بیڑا اپنے سر اٹھایا وہ سرسیّد احمد خان کی ذات تھی۔ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ اردو کے شعرا و ادبا کو نئی روشنی دکھائی تاکہ وہ اپنی سوچ و فکر میں تبدیلی لا سکیں۔ اسی لیے انھوں نے حصولِ علم کی جانب سب سے پہلے توجہ دی اور مغربی علوم سیکھنے پر بھی زور دیا۔ سرسیّد کے زمانے تک اردو ادب محدود موضوعات کی گھیرابندی میں

قید تھا۔ یہ موضوعات قصہ کہانی، حسن و عشق اور گل و بلبل کے ذکر سے بھرے پڑے تھے۔ سرسیّد نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ ادب کو حقیقت سے قریب کیا جائے۔ سرسیّد نے ایسے موضوعات پر لکھا جو اس سے قبل اردو ادب میں نہیں لکھے گئے تھے۔ سرسیّد کی پہلی کتاب ''آثار الصنادید'' ہے جس میں انھوں نے دلّی کی قدیم عمارتوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ حالی اعلیٰ درجے کے شاعر، بہترین انشاء پرداز، نقاد اور باکمال سوانح نگار بھی تھے۔ مقدمۂ شعر و شاعری ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے اردو میں جدید تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ شبلی نعمانی نے سوانح نگاری، تاریخ اور تنقید کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی عظیم الشان سوانح عمری ''سیرت النبی ﷺ'' ہے۔ نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے، جو 1869ء میں لکھا گیا۔ اپنے ناولوں کے ذریعہ نذیر احمد نے سماجی مسائل کی اصلاح کی کامیاب کوششیں انجام دیں۔ سرسیّد کے اہم رفقا میں ایک بڑا نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' کی اہمیت نہ صرف اس کے اسلوب کی وجہ سے ہے بلکہ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اسے سب سے پہلے اردو زبان کی تاریخ کا امتیاز حاصل ہے۔

سرسیّد تحریک کا اثر نثر نگاری کے علاوہ شاعری پر بھی پڑا۔ حالی نے سرسیّد کی ایما پر مسدس کی شکل میں اپنی شاہ کار نظم ''مدوجزرِ اسلام'' لکھی۔ اردو شاعری کو جدید رنگ و روپ دینے میں آزاد کی اہم خدمات رہی ہیں۔ انھوں نے مثنوی کی ہیئت میں کئی نظمیں لکھیں اور اردو کی نظمیہ شاعری میں توسیع کی عملی کوشش کی۔ شبلی نعمانی کی شعری تخلیقات میں مثنوی، مسدس، مرثیہ، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی اور نظمیں شامل ہیں۔ اس دور کے شعرا میں ایک اہم نام اسماعیل میرٹھی کا بھی ہے۔ ان کی نظموں میں مشرقی تہذیب کا وقار ملتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے شعری سفر کا آغاز قدیم طرز کی شاعری سے کیا تھا لیکن جلد ہی وہ جدید طرز کی نظمیں لکھنے لگے۔ اسی لیے انھیں ''لسان العصر'' کا خطاب ملا۔ ان کا کلام طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ عہدِ سرسید میں نظم نگاری کے علاوہ غزل میں بھی جدید انداز اختیار کیا گیا۔ منشی امیر احمد مینائی کی غزلوں میں شگفتگی، شیرینی اور بلا کی سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات زبان کی صفائی، سلاست و روانی، شیرینی و بلاغت، بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کی دل کشی ہے۔

21 جنوری 1865ء کو جب لاہور میں انجمنِ پنجاب کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پرچم تلے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔اس انجمن کے ذریعے محمد حسین آزاد نے اس روایت کا آغاز کیا کہ طرحی مشاعروں کی بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھی جائیں۔موضوعاتی مشاعروں کے علاوہ یہاں مختلف مضامین پر بحث ومباحثے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جو بے حد مقبول ہوا۔ان جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث کی اجازت نے اردو ادب میں صحت مند تنقید کو فروغ دیا جس سے ادب کو فائدہ پہنچا۔اقبال کے دور کا اردو ادب بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔علمی اور سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔آزادی حاصل کرنے کے لیے ملک میں مختلف تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔اقبال کے عہد میں جہاں ایک طرف ''ادبِ لطیف'' کی تحریک میں رومانیت، حسن پرستی اور ادب برائے ادب کی باتیں بیان کی جارہی تھیں تو وہیں دوسری طرف پریم چند اور دیگر قلم کار حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کا فلسفہ پیش کررہے تھے۔''ترقی پسند تحریک'' اور ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے رجحانات کے اثرات بھی اس دور میں ملتے ہیں۔اس عہد میں اقبال ایک قد آور دانشور کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتے ہیں۔اقبال کے ہم عصر شعرا میں ظفر علی خاں، چکبست لکھنوی، سرور جہان آبادی، عظمت اللہ خاں، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی، ریاض خیرآبادی، آرزو لکھنوی، جلیل مانک پوری اور فراق گورکھ پوری کے نام اہم ہیں۔عہدِ اقبال اردو نثر کے حوالے سے بھی اہم مانا جاتا ہے۔اس عہد میں سادہ اور عام نثر کا چلن رائج ہو چکا تھا۔عہدِ اقبال میں جہاں علمی نثر کو فروغ ملا وہیں ادبی نثر کا منظر نامہ بھی تبدیل ہوا۔ناول، ڈراما، افسانہ، ناولٹ، افسانچہ، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، خودنوشت، آپ بیتی، روزنامچہ نویسی، سفرنامے، رپورتاژ، خاکہ نگاری، تحقیق، تنقید، صحافت اور مکتوب نگاری کی روایت بھی مستحکم ہوئی۔اس عہد میں شرر، رسوا، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، علی عباس حسینی، آغا حشر کاشمیری، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریا آبادی، مولوی عبد الحق، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، برج موہن کیفی، سیّد سلیمان ندوی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی نے اپنے اپنے میدانِ نثر میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

3.9 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1- سرسیّداحمد خاں کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2- 1857ء کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

3- حالی اور نذیر احمد کی خدمات کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1- عہدِ سرسیّد میں اردو شاعری کو مفصل بیان کیجیے۔

2- انجمنِ پنجاب کی تحریک کا جائزہ لیجیے۔

3- اقبال کے ہم عصر شعرا کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

3.10 فرہنگ

آثار : یادگار چیزیں، جو چیزیں مٹتی نہیں ہیں۔

صنادید : صنید کی جمع، اس کے معنی سردار یا بادشاہ کے ہیں۔

محاسبہ : جائزہ لینا

حصول : حاصل کرنا

رفقا : رفیق کی جمع، دوست، ساتھی

سوانح نگاری : کسی شخص کی زندگی کے حالات لکھنا

اسلوب : لکھنے کا انداز، طرزِ بیان

گراں مایہ : قیمتی، اہم، قابل قدر

ثمر : پھل، نتیجہ

بصیرت : پرکھ، سمجھ

مفکر : غور وفکر کرنے والا

فرسودہ : پرانا، روایتی

مبالغہ آرائی : کسی بات کو حد سے زیادہ بڑھا کر بیان کرنا۔

فعال : متحرک

مثبت : اچھا، صحیح

دانشور : عقل مند

افکار : فکر کی جمع، سوچ، خیال

مے خوار : شراب پینے والا

فراق : جدائی

ہم عصر : ایک ہی زمانے کے لوگ

3.11 معاون کتابیں

1- پروفیسر نورالحسن نقوی — تاریخِ ادب اردو

2- ابواللیث صدیقی — آج کا اردو ادب

3- سیّد عبداللہ — سرسیّد اور ان کے رفقا

4- ڈاکٹر انور سدید — اردو ادب کی تحریکیں

3.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1- پہلی جنگِ آزادی کی آواز 1857ء میں بلند ہوئی۔

2- سرسیّد کی اصلاحی تحریک کا نام سرسیّد تحریک اور علی گڑھ تحریک پڑا۔

3- 1857ء کی جنگِ آزادی کا ردِعمل یہ ہوا کہ انگریزوں نے آزادی کے جذبے سے سرشار لوگوں کو قتل کرنا اور انھیں وطن سے دور بھیجنا شروع کر دیا۔

4- ''آثارالصنادید'' میں دلی کی قدیم عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

5- اردو کے پہلے ناول کا نام ''مراۃ العروس'' ہے۔

6- اردو ادب کے عناصر خمسہ سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد ہیں۔

7- ''مدوجزر اسلام'' کے حوالے سے سرسیّد نے کہا کہ خدا اگر مجھ سے یہ سوال کرے کہ میں نے دنیا میں کون سا اچھا کام کیا ہے تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے مدوجزرِ اسلام لکھوایا ہے۔

8- داغ کی شاعرانہ خصوصیات زبان کی صفائی، سلاست و روانی، شیرینی و گھلاوٹ، بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کی دل کشی وغیرہ ہیں۔

9- ''صنم خانہ عشق'' امیر احمد مینائی کا شعری مجموعہ ہے۔

10- انجمن پنجاب کا قیام 21 جنوری 1865ء کو لاہور میں عمل میں آیا۔

11- انجمن پنجاب کے زیر اہتمام 10 مشاعرے منعقد ہوئے۔

12- انجمن پنجاب کا آخری مشاعرہ 13 مارچ 1875ء کو ہوا جس کا موضوع تہذیب تھا۔

13- عہدِ اقبال میں ملک کی آزادی کے لیے خلافت تحریک، ترکِ موالات تحریک، سول نافرمانی تحریک اور ہندوستان چھوڑو تحریکیں چل رہی تھیں۔

14- اردو میں اقبال کے تین شعری مجموعے ہیں۔ بانگِ درا، بالِ جبرئیل اور ضربِ کلیم۔ اس کے علاوہ ارمغان حجاز میں بھی اُن کا اُردو کلام شامل ہے۔

15- اقبال کے ہم عصر شعرا میں حسرت موہانی، چکبست لکھنوی اور جوش ملیح آبادی ہیں۔

بلاک نمبر 2

اُردو قواعد

اکائی 4. جملے کی بناوٹ

اکائی 5. موئنث مذکر، واحد جمع، متضاد، مترادف

اکائی 6. محاورے اور کہاوت

اکائی 7. اُردو کی شعری اصطلاحات

یہ بلاک درج بالا چار اکائیوں پر مشتمل ہے اور جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے اس پورے بلاک میں اُردو قواعد کے تمام بنیادی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دراصل کسی بھی زبان کی قواعد سے واقفیت، اُس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کے معیار میں اضافہ کرتی ہے۔ قواعد اُن اصولوں تک ہماری رہنمائی کرتی ہے جن کی پیروی کرتے ہوئے ہم اچھی زبان نہ صرف خود بول اور لکھ سکتے ہیں بلکہ دیگر لوگوں کے معیارِ گفتگو اور طرز تحریر کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ بات چیت تو وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو قواعد سے واقف نہیں ہوتے لیکن اُن کی بات چیت میں عموماً وہ لطف اور درستگی نہیں ہوتی جو قواعد کے جاننے والوں کے یہاں ہوتی ہے۔

اس بلاک کو جملے کی بناوٹ سے شروع کیا گیا ہے۔ پھر اُن بنیادی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی غلطیاں

ہمارے سماج میں عام ہیں۔لوگ مونث مذکر، واحد جمع اور متضاد ومترادفات کے استعمال میں عموماً غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک مکمل اکائی انہیں امور پر مشتمل ہے۔زبان کو سجانے سنوارنے اور اسے خوبصورت بنانے میں محاوروں اور کہاوتوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔لہٰذا ایک اکائی اسی سے متعلق ہے۔اس اکائی میں بے شمار محاوروں اور کہاوتوں کو درج کیا گیا ہے۔ان کے استعمال بتائے گئے ہیں اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی اُس کے مفہوم کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ روزمرہ میں بولے جانے محاوروں اور کہاوتوں کو خاصی اہمیت دی گئی ہے اس لیے کہ ان کے استعمال سے زبان میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔آپ اس اکائی کو نہ صرف ایک سبق کے طور پر پڑھیں بلکہ اس میں درج محاروں اور کہاوتوں کو اپنے عام بول چال کے دوران اور لکھتے وقت استعمال کرنے کی عادت ڈالیے۔

اُردو کے سیکڑوں اشعار ہم اُٹھتے بیٹھتے سنتے اور سناتے رہتے ہیں۔اس کے معنی ومفہوم کے ساتھ اس کی موسیقیت سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔کبھی کوئی شعر برموقع پڑھ دیا جائے تو اُس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔لیکن ہم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جو ان اشعار میں استعمال ہونے والی اصطلاحات سے واقف نہیں ہیں۔شاعر جانتا ہے یا اساتذہ جانتے ہیں کہ مطلع کیا ہے؟مقطع کسے کہتے ہیں؟ تشبیہ، استعارہ اور کنایہ سے کیا مراد ہے؟لیکن اگر آپ اس اکائی کو غور سے پڑھیں گے اور اس میں دی گئی مثالوں کی مشق کریں گے تو بلاشبہ آپ بھی ان اصطلاحات سے واقف ہو جائیں گے۔

مجموعی طور پر اس بلاک کی چاروں اکائیاں زبان کی باریکیوں اور نزاکتوں سے متعلق ہیں۔آیئے اب ہم اِن باریکیوں اور نزاکتوں کے تمام پہلوؤں کا وضاحت کے ساتھ اور قدرے تفصیل سے مطالعہ کریں!

اکائی 4: جملے کی بناوٹ

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 حروف

4.3.1 حروف تہجی

4.3.2 اعراب

4.4 لفظ

4.4.1 لفظ کی اقسام

4.5 جملے

4.5.1 جملے کی اقسام

4.6 کلمہ کی اقسام

4.6.1 اسم

4.6.2 صفت

4.6.3 ضمیر

4.6.4 فعل

4.6.4.1 فاعل

4.6.4.2 مفعول

4.6.5 تمیز

4.6.6 حرف

4.7 خلاصہ

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 معاون کتابیں

4.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد اردو زبان کی قواعد سے متعارف کرانا ہے۔ زبان کو جاننے یا ادب کو پڑھنے کے لیے قواعد کی سمجھ بہت ضروری ہوتی ہے۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ اپنی زبان کی قواعد سیکھنے کی کیا ضرورت وہ تو بچپن سے سننے اور بولنے میں خود آ جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ مادری زبان میں قواعد کے بہت سے نکتے ہم بغیر پڑھے سیکھ جاتے ہیں۔ لیکن زبان کا علم بہت وسیع ہے اور اس میں نہ جانے کتنی شاخیں ہیں۔ اس لیے زبان کے استعمال کے سارے گوشوں کو سمجھنے کے لیے قواعد سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ پھر بہت سے ایسے لوگ بھی زبان سیکھنے اور پڑھنے کے لیے آتے ہیں جن کی وہ مادری زبان نہیں ہوتی اور وہ قواعد جانے بغیر زبان نہیں سیکھ سکتے۔ اس لیے ابتدا سے ہی قواعد کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ اس اکائی کا مقصد بھی آپ کو زبان کے مختلف پہلوؤں سے واقف کرانا ہے تا کہ آپ زبان کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھ سکیں اور اس کا لطف لے سکیں

4.2 تمہید

زبان کو صحت کے ساتھ بولنا بغیر قواعد سے واقف ہوئے ممکن نہیں۔ ہر زبان میں جملوں کی ساخت اور ان کے بنانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ واحد اور جمع کے صیغے بنانے کا صحیح طریقہ ہمیں قواعد کے مطالعے سے ہی آتا ہے۔ زبان کے تعلق سے ان بنیادی باتوں کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ ان سے ہم جملے بنانے کے طریقے سیکھتے ہیں

۔قواعد ہم کو حرف اور لفظ کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے گر سکھاتی ہے۔ اردو دوسری زبانوں سے مختلف ہے وہ سنسکرت، فارسی، عربی، کھڑی بولی، اودھی، برج، پنجابی اور دکنی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ اس لیے ان تمام زبانوں کے حروف اور آوازیں اس میں شامل ہیں۔ اس لیے اردو کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ اس میں ساری آوازیں موجود ہیں اور اردو بولنے والے دنیا کی دوسری زبانیں صحیح تلفظ کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ آپ بھی توجہ سے اس اکائی کو پڑھیں اور اپنی تحریر وتقریر میں صحیح زبان کا استعمال کریں۔

4.3 حروف

زبانیں حروف سے بنتی ہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں کچھ متعین حروف ہوتے ہیں۔ ان حروف کو انگریزی میں Alphabets اور اردو میں حروف تہجی کہتے ہیں۔ انگریزی میں ان کی تعداد صرف 26 ہے یعنی A سے Z تک صرف 26 حروف ہیں لیکن اردو میں الف سے ے (ا۔ی) کی تعداد 35 ہے۔ جو آپ روز پڑھتے اور دیکھتے ہیں اور جسے آپ نے اس وقت یاد کیا ہوگا جب آپ چھوٹے تھے۔ بہرحال ایک بار پھر آپ ان کو دیکھ لیں۔

4.3.1 حروف تہجی

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی = 35 لیکن اگر ان میں ہنکار حروف Aspirated Letter مثلاً بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ ملا لیں تو ان کی تعداد 46 ہو جاتی ہے اب دیکھیے کہ ہماری زبان کی بنیاد یہ کل 46 حروف ہیں۔

4.3.2 اعراب

اس کے ساتھ ایک چیز اور سمجھ لیں کہ الفاظ کو صحیح پڑھنے اور بولنے کے لیے اردو میں اعراب کا استعمال کیا جاتا ہے یعنی زیر، زبر، پیش، جزم، دو زبر، تشدید اور مد۔ اگر حروف پر یا اُن کے نیچے اعراب نہ لگائیں تو ہم سے لفظ کا تلفظ ادا کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے یا اس کے معنی بدل سکتے ہیں اس لیے حروف کے ساتھ اعراب کو پہچاننا اور یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔

4.4 لفظ

ابھی لفظ کا ذکر آیا آپ کہیں گے کہ لفظ کیا ہے؟ لفظ دراصل کئی حروف کے جوڑ سے بنایا جاتا ہے۔ مثلاً کھیل اس میں تین حروف ہیں کھ+ی + ل = کھیل ' اس لیے یاد رکھیے کہ ایک سے زیادہ حروف کے ملنے سے لفظ بنتا ہے۔ صرف حروف کوئی معنی نہیں رکھتے لفظ بیشتر معنی کا حامل ہوتا ہے۔

4.4.1 لفظ کی اقسام

لفظ کی بات آئی تو ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ لفظ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے کوئی معنی ہوتے ہیں جیسے عیب یعنی برائی' فلک یعنی آسمان' زلف یعنی بال۔ ایسے الفاظ کو بامعنی لفظ کہتے ہیں لیکن ایسے بھی لفظ ہوتے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے جیسے سروم' ارگر' یا آپ معنی والے کچھ الفاظ کے ساتھ ایک لفظ لگا دیتے ہیں۔ مثلاً چائے وائے' کھانا وانا وغیرہ۔ اس میں چائے اور کھانا کے معنی ہیں اور وائے اور وانا بے معنی ہیں۔ بامعنی الفاظ کو کلمہ کہتے ہیں اور بے معنی الفاظ کو مہمل کہتے ہیں۔

اب آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ حروف سے مل کر لفظ بنتے ہیں اور یہ لفظ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک کلمہ اور دوسرے مہمل۔

4.5 جملے

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ دن بھر کسی سے بات کرتے یا کچھ لکھتے ہیں۔ یہ گفتگو ہم کس طرح کرتے ہیں۔ ہم بات کرنے کے لیے جملوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جملہ حروف کی تیسری منزل ہے یعنی پہلے حروف سے لفظ بنے' پھر لفظوں سے مل کر جملے بنے۔ اور جملے بنانے کا کام ہمارا دماغ دن بھر کرتا رہتا ہے۔ ہمیں جس طرح بات کہنے یا لکھنے کی ضرورت ہو ہمارا دماغ اس طرح کے الفاظ جمع کر کے جملے بنانا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً

سلیم تم کہاں جا رہے ہو؟

قدیر اس وقت ذرا گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔

کیا ہوا! سب خیریت تو ہے؟

تم کو نہیں معلوم آج آسٹریلیا اور انڈیا کا کرکٹ میچ ہے۔

یہ ساری گفتگو جملوں کے ذریعے ہی ہوئی اور ان کے ذریعہ جو بات کہی گئی وہ پڑھنے یا سننے میں سمجھ میں آتی ہے۔ اس طرح دن بھر ایک دوسرے سے بات کرنے میں جملوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

''جملہ الفاظ کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جس سے بات پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔'' یعنی کسی سے کوئی بات کہنے یا کسی تک کوئی بات پہنچانے کا کام جملے کے ذریعے ہی مکمل ہوتا ہے۔ یہاں پر سہولت کے لیے ایک بات اور ذہن میں رکھیں کہ جملے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ ہم کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی اداس، کبھی ہمیں غصہ آتا ہے کبھی ہم کچھ پوچھتے ہیں۔ کبھی ڈانٹتے ہیں، کبھی محبت سے بات کرتے ہیں۔ ان تمام جذبات کا اندازہ جملوں سے ہی ہوتا ہے۔ یعنی جملہ کس بات یا جذبے کو دوسرے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً

ماں میں پاس ہو گیا۔ (خوشی کا اظہار)

حسن تمہارا نتیجہ کب آئے گا؟ (سوالیہ)

آج وہ دہلی سے واپس آ گیا ہے۔ (اطلاعاتی)

4.5.1 جملے کی اقسام

اوپر کے جملوں میں ہم نے دیکھا کہ ان میں ایک خاص طرح سے بات کہی گئی ہے لیکن جملے کے عناصر کتنے ہیں؟ اور جملہ کس طرح ترتیب پاتا ہے اس کو اب بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جملے کے دو عناصر ہوتے ہیں۔ ایک کو ''مبتدا'' کہتے ہیں اور دوسرے کو ''خبر''

مبتدا: وہ شخص یا چیز ہے جس کا ذکر کیا جائے۔

خبر: جو کچھ اس شخص یا چیز کے تعلق سے کہا جائے خبر ہے۔

مثلاً ہلدوانی میں ان دنوں نمائش لگی ہے

اترا کھنڈ کی راجدھانی دہرہ دون ہے

پہلے جملے میں ہلدوانی ''مبتدا'' ہے اور ''میں ان دنوں نمائش لگی ہے۔'' خبر۔ اسی طرح دوسرے جملے میں اترا کھنڈ مبتدا ہے اور اس کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا وہ خبر ہے۔ اس کی ایک اور آسان پہچان یہ ہے کہ جس کے بارے میں جو کچھ کہا جائے یعنی جو عمل یا فاعلی حالت میں ہو وہ مبتدا ہے مثلاً کبھی ہم کہتے ہیں۔

وہ کولکتہ سے آیا ہے۔ یا نہانا تندرستی کے لیے ضروری ہے۔ یہاں وہ اور نہانا فاعلی حالت میں ہیں اس لیے تدا ہیں۔

پنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

لفظ کسے کہتے ہیں؟

بامعنی لفظ کو کیا کہتے ہیں؟

جملہ کیسے بنتا ہے؟

جملے کے دو عناصر کون کون سے ہیں؟

کلمہ کی اقسام

آپ کو یاد ہوگا کہ شروع میں یہ بات آئی تھی کہ کلمہ ایسے الفاظ کو کہتے ہیں۔ جن کے معنی ہوتے ہیں لیکن کیا علوم ہے کہ کلمے کی چھ قسمیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ قسمیں ہیں۔

(1) اسم (2) صفت (3) ضمیر (4) فعل (5) تمیز (6) حرف

اسم

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ اپنی گفتگو، تقریر یا تحریر میں اکثر نام لیتے ہیں کبھی کسی شہر کا کبھی کسی شخص کا، کبھی ۔ یہی نام اسم کہلاتے ہیں۔ مثلاً

بئی سمندر کے ساحل پر آباد ہے۔

نی تال بہت خوب صورت اور پُر فضا شہر ہے۔

سلمان دہلی سے ٹی وی لایا ہے۔

لکھنو کے چڑیا گھر میں سفید شیر ہے۔

ان جملوں میں نینی تال، شہر، ممبئی، سلمان، دہلی، ٹی وی، لکھنو، چڑیا گھر، شیر سب اسم ہیں اس لیے ہم اسم کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

''اسم وہ کلمہ ہے جو کسی شخص، جگہ، جانور یا چیز کا نام ہو۔''

(الف)

اسم کی دو قسمیں ہیں اگر آپ غور کریں تو اوپر جو اسم آئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ کسی خاص جگہ کا نام یا عام نام مثلاً نینی تال، ممبئی، سلمان، دہلی، لکھنؤ خاص نام ہیں۔ جس طرح لندن، نیویارک، دوبئی، احمد، گنگا، جمنا، رادھا، شیلا، کنیا کماری جو صرف خاص جگہ یا اشخاص کے نام ہیں لیکن کچھ عام بھی ہوتے ہیں جیسے شہر، چڑیا گھر، شیر، سمندر یا اسی طرح اسکول، کتاب، پہاڑ، دریا وغیرہ۔ جس سے کوئی خاص دریا، کتاب، سمندر، شہر یا پہاڑ نہیں مراد ہوتا۔ اس طرح اسم کی دو قسمیں ہوئیں۔ اسم معرفہ اور اسم نکرہ۔

اسم معرفہ: وہ اسم ہے جو کسی خاص شخص چیز یا جگہ کا نام ہو جیسے احمد، گنگا، رادھا، ہمالیہ، ہلدوانی وغیرہ۔

اسم نکرہ: وہ اسم ہے جس سے ایک ہی طرح کی تمام چیزیں مراد ہوں جیسے دریا، شہر، پہاڑ، اسکول، کتاب، بازار، دوکان وغیرہ۔

4.6.2 صفت

کلمہ کی دوسری قسم صفت ہے۔ صفت آپ اپنی بات چیت میں برابر استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اس کی صفت یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ یعنی صفت کسی چیز کی خوبی، اچھائی، برائی یا اس کی کسی طرح کی خصوصیت ہلکا، موٹا، سرخ، سبز، خوشبو، شریر، چالاک وغیرہ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ اسم کے پھیلاؤ کو کم کر دیتی ہے۔ مثلاً جب ہم کہیں خوشبودار پھول، تو پھول تو بے شمار ہیں لیکن صفت نے اسم کی حالت کو محدود کر دیا کہ سارے پھول نہیں صرف خوشبودار پھول۔ اسی طرح خوبصورت لڑکا، بہادر نوجوان، تیز بلے باز، چنچل لڑکی وغیرہ۔

صفت کی اقسام

اسم کی طرح صفت کی بھی کئی قسمیں ہیں جس کی پہلی قسم ''صفت ذاتی'' ہے۔ آیئے اب چند جملے دیکھیں جن سے صفت ذاتی کا اظہار ہوتا ہے۔

(الف) صفت ذاتی

آم میٹھے ہیں۔ نینی تال کی جھیل خوبصورت ہے۔ یوسف کا مزاج گرم ہے۔ شلپا چنچل لڑکی ہے۔ احمد ڈاکٹر ہے۔ چاقو تیز ہے۔ ان جملوں میں میٹھے، خوبصورت، گرم، چنچل، ڈاکٹر، تیز صفات ہیں۔ یہ صفات یا خوبیاں کسی چیز جگہ یا شخص سے وابستہ ہیں اس طرح کی صفات کو صفت ذاتی کہتے ہیں اس کی تعریف ہم اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔

صفت ذاتی: وہ صفت ہے جو کسی شخص، چیز یا جگہ کی خصوصیت کو ظاہر کرے۔ مثلاً ہرا طوطا، بڑا آدمی، تیز گھوڑا، کھٹے انگور، خوبصورت شہر وغیرہ۔

(ب) صفت نسبتی

صفت کی قسموں میں ایک قسم صفت نسبتی ہے جو کسی جگہ یا چیز سے تعلق کا اظہار کرتی ہے۔ مثلاً نیچے لکھے جملوں کو دیکھیے

1. غالب دہلوی کا نام اسد اللہ خاں تھا۔
2. ولی دکنی اردو کے بڑے شاعر تھے۔
3. ملیح آبادی آم کا کیا کہنا۔
4. کشمیری شال خوب گرم ہے۔

ان جملوں میں چیزوں یا اشخاص کی کسی جگہ سے نسبت ظاہر کی گئی ہے۔ غالب کی نسبت دہلی سے ولی کی نسبت دکن سے، آم کا تعلق ملیح آباد سے، شال کشمیر کی۔ اسی کو صفت نسبتی کہتے ہیں۔

صفت نسبتی: صفت کی وہ قسم ہے جو کسی تعلق کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔ مثلاً سندھی لڑکی، کشمیری شال، بنگالی مٹھائی، ملیح آبادی آم۔

(ج) صفت عددی

اسی طرح صفت کی ایک قسم صفت عددی ہوتی ہے یعنی جس کے ساتھ کسی گنتی کا استعمال ہو یا جس سے ہمیں تعداد معلوم ہو۔

میرے کلاس میں بیس طالب علم ہیں۔

میرے ساتھ آٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

کل ایک آدمی آپ سے ملنے آیا تھا۔

کیف نے چار اوور میں تین وکٹ لیے۔

آپ غور کریں کہ ہر جملے میں گنتی کا استعمال ہوا ہے۔ بیس طالب علم، آٹھ لڑکیاں، ایک آدمی، چار اوور، تین وکٹ، اور یہی گنتی یا عدد اس کی صفت ہیں۔ اس لیے اسے صفت عددی کہتے ہیں۔ اس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔

صفت عددی: وہ صفت ہے جس سے تعداد معلوم ہو۔ مثلاً چار پیر، سال کے بارہ مہینے، ایک لڑکی، چند دن، بہت سے لوگ وغیرہ۔

(د) صفت مقداری

صفت عددی کی طرح صفت مقداری بھی ہوتی ہے۔ صفت عددی کا تعلق گنتی یعنی تعداد سے ہے اسی طرح صفت مقداری کا تعلق ناپ تول، مقدار اور وزن سے ہے۔ مثلاً

اس سے کئی لیٹر تیل گر گیا

مجھے چار میٹر کپڑے کی ضرورت ہے۔

وہ دو کلو چینی لایا ہے۔

اس کا قد چھ فٹ ہے۔

جتنا پانی پیو اتنی ہی پیاس لگتی ہے۔

ان جملوں میں کئی لیٹر، چار میٹر، چھ فٹ، دو کلو، جتنا، اتنا سب مقدار کو ظاہر کرتے ہیں۔ چار، دو چھ میں مقدار واضح ہے۔ کئی جتنا اور اتنا میں مقدار واضح نہیں ہے۔ لیکن دونوں کا تعلق مقدار سے ہے اسی کو صفتِ مقداری کہتے ہیں۔

4.6.3 ضمیر

ہم اپنی گفتگو یا تحریر میں کبھی اسم یعنی نام لینے کے بجائے کچھ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے

وہ ملنے آیا تھا

میں آج بازار گیا تھا

وہ اسی شہر میں رہتا ہے

تم دہلی کب جاؤ گے؟

تمہارا نام کیا ہے؟

اس کا دوست آیا تھا۔

ان جملوں میں کسی کا نام لینے کے بجائے وہ، میں، اسی، تم، تمہارا اور اس کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسم کے بجائے آنے والے الفاظ کو ضمیر کہتے ہیں۔

ضمیر: وہ کلمہ ہے جو اسم کے بجائے اس کی جگہ پر بولا جاتا ہے۔

اگر آپ اپنی دن بھر کی گفتگو پر دھیان دیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اپنی بات چیت میں اکثر ضمیر کا استعمال کرتے ہیں اور یہ استعمال اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ بار بار (نام) اسم کو دہرانا زبان کے لحاظ سے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے۔

1. رمیش نے کہا کہ وہ نینی تال گیا تھا۔ وہاں سے پھل اور لکڑی کا بنا سامان لایا ہے۔
2. الیاس نے کہا کہ اسے نینی تال جانے کا موقع نہیں ملا سنا ہے وہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔

ان جملوں میں وہ (رمیش کے لیے) وہاں نینی تال کے لیے اسے (الیاس کے لیے) وہ (نینی تال) کے

لیے استعمال ہوئے ہیں جو اسم کی جگہ پر لائے گئے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیے کہ اسم کی جگہ پر استعمال ہونے والے کلمہ کو ضمیر کہتے ہیں۔

(الف) ضمیر کی قسمیں

ضمیر کی تین صورتیں ہیں جن میں پہلی صورت کو 'ضمیر متکلم' کہتے ہیں۔ متکلم کے معنی آپ جانتے ہیں کہ بات کرنے والے کے ہیں۔ اس لیے جو الفاظ بات کرنے والے کے نام کے بجائے استعمال ہوں وہ ضمیر متکلم کہلاتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھیں کہ:

ضمیر متکلم: اس صورت کو کہتے ہیں جو بات کرنے والے کے بجائے استعمال ہو۔

اوپر کے جملوں کو دیکھیے کہ رمیش اور الیاس بات کر رہے ہیں اور ان جملوں میں ان کے نام اور نینی تال کے بجائے وہ، وہاں، اسے وہ وغیرہ استعمال کئے گئے ہیں۔ یہی ان کے نام کے بجائے آنے والے الفاظ / صورتیں ضمیر متکلم کہی جاتی ہیں۔

(ب) ضمیر حاضر

اس طرح ضمیر کی دو صورتیں اور ہیں جنہیں ضمیر حاضر اور ضمیر غائب کہتے ہیں۔ ضمیر حاضر، ضمیر کی وہ صورت ہے جو ان لوگوں کے بجائے استعمال ہو جو بات کرتے وقت سامنے موجود ہوں۔ مثلاً ان جملوں کو دیکھیے:

1. شیلا نے رضیہ سے کہا کہ تم آج گھر واپس نہ جاؤ۔
2. آپ جانتے ہیں کہ میں کھانے میں بہت پرہیز کرتا ہوں۔
3. رمیش! تم کو تو میں نے صبح دس بجے بلایا تھا۔
4. تمہارے نام کیا ہیں؟ اور تم لوگ یہاں شور کیوں کر رہے ہو۔

ان جملوں پر ایک بار پھر غور کیجیے۔ جن سے گفتگو کی جا رہی ہے وہ سامنے موجود ہیں جن کے لیے تم، آپ اور تمہارے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جب سامنے موجود کے لیے نام کے بجائے تم، آپ، تمہارے، تم لوگ یا اسی

طرح کا کوئی دوسرا لفظ تو اسے ضمیر حاضر کہتے ہیں۔

(ج) ضمیر غائب

لیکن اگر سامنے آدمی موجود نہیں ہے اور گفتگو میں اس کا حوالہ آتا ہے تو اسے ضمیر غائب کی صورت قرار دیا جاتا ہے۔

ضمیر غائب: ضمیر کی اس صورت کو کہتے ہیں جو ان لوگوں کے لیے استعمال ہو جو متکلم (یعنی بات کرنے والے) کے سامنے موجود نہیں ہیں۔

1. میں نے شکیل سے کہہ دیا ہے کہ اس کو دہلی جانا ہے۔
2. بہت دنوں بعد وہ آنے والا ہے۔
3. میں نے خط لکھ کر ان کو بلایا تھا لیکن وہ نہیں آئے۔
4. انہوں نے رمیش کو کتابیں لانے کے لیے بھیجا ہے۔

اب دیکھیے کہ ان جملوں میں 'اُس' 'وہ' 'ان' اور 'انہوں' ضمیر غائب ہیں اس لیے کہ یہ ایسے لوگوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جو بات کرتے وقت موجود نہیں ہیں۔ اس لیے یاد رکھیے کہ ضمیر کا لفظ اگر غیر موجود لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اسے ضمیر غائب کہتے ہیں۔

4.6.4 فعل

کلمہ کی قسموں میں چوتھی قسم فعل ہے۔

فعل: وہ کلمہ ہے جس سے کسی کام کا ہونا یا کرنا معلوم ہو اور اس میں کوئی زمانہ بھی پایا جائے۔ مثلاً ان جملوں کو دیکھیے

1. ثنا کھانا کھا رہی ہے۔
2. عابد ممبئی گیا تھا۔
3. اختر بازار جائے گا۔

ان جملوں میں کھا رہی ہے۔ گیا تھا۔ اور جائے گا سے کام کا ہونا اور اس کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ ثنا کر رہی

ہے۔عابد کر چکا ہے اور اختر کرے گا۔زمانے اور عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔اسی طرح۔

1. رمیش اسکول جا رہا ہے۔
2. ارم کتاب پڑھ رہی ہے۔
3. مینا گانا گا رہی ہے۔

ان سب جملوں میں کام حال میں ہو رہا ہے اسے فعل حال کہتے ہیں۔

1. عابد ممبئی گیا تھا۔
2. وہ کھانا کھا چکا۔
3. کل اس نے گانا گایا تھا۔

گیا تھا۔کھا چکا اور گایا تھا۔کام کے ختم ہو جانے کو ظاہر کرتے ہیں اس لیے یہ فعل ماضی ہوا۔اسی طرح

1. وہ لکھنو جائے گا
2. احمد شام کو کھانا یہیں کھائے گا۔
3. کل جلسے میں شیبا گانا گائے گی۔

جائے گا' کھائے گا اور گائے گی افعال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام ابھی ہونا باقی ہے جو آنے والے وقت یا دنوں میں کیا جائے گا۔اسے فعل مستقبل کہتے ہیں۔

فعل کی قسمیں

معنی کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) فعل لازم (ب) فعل متعدی (ج) فعل ناقص

(الف) فعل لازم

وہ فعل ہے جس کو پورا کرنے کے لیے مفعول کی ضرورت نہ ہو۔یعنی اپنی جگہ پر بغیر کسی دوسرے کے مکمل ہو۔ مثلاً موہن آیا۔اختر سویا۔مینا بولی۔

آیا۔سویا۔بولی ایسے فعل ہیں جس کو پورا کرنے کے لیے مفعول کی ضرورت نہیں ہے۔ایسے فعل کو فعل لازم کہتے ہیں۔

(ب) فعل متعدی

فعل متعدی وہ فعل ہے جس کا اثر مفعول تک پہنچے یعنی جو مفعول کے بغیر مکمل نہ ہو جیسے: شیبا نے خط لکھا۔ یہاں پر لکھا فعل متعدی ہے۔شیبا لکھنے کا کام انجام دے رہی ہے۔اس لیے وہ فاعل ہے اور خط جو لکھا گیا یا جس پر لکھنے کا فعل واقع ہوا۔وہ مفعول ہے۔مثلاً یہ چند جملے دیکھیے۔

1. احمد نے قلم خریدا
2. نریش نے میز اٹھائی
3. اختر نے جوتا پہنا

(ج) فعل ناقص

فعل ناقص وہ فعل ہے۔جو کسی پر اثر نہ ڈالے۔بلکہ کسی اثر کو ثابت کرے۔جیسے رشید بیمار ہے۔اس جملے میں فعل کا کرنا نہیں بلکہ ہونا پایا جاتا ہے۔رشید جو یہاں فاعل ہے کام کرنے والا نہیں بلکہ فعل کا سہنے والا ہے۔فعل ناقص کام کے بارے میں خبر دیتا ہے۔اوپر کے جملے میں ''بیمار'' خبر کی حالت ہے۔

1. حامد گر پڑا۔
2. لڑکی پھسل گئی۔
3. وہ بڑا بے وقوف ہے۔

یہ جملے بھی فعل ناقص کی مثالیں ہیں۔

4.6.4.1 فاعل

کسی بھی کام کے کرنے والے کو فاعل کہتے ہیں۔جس نے کوئی کام کیا ہو یا وہ کر رہا ہو۔جیسے

حامد کتاب پڑھ رہا ہے۔یہاں حامد کتاب پڑھنے کا کام کر رہا ہے۔اس لیے حامد فاعل ہے۔

میرا کھیل رہی ہے۔ مداری بندر نچا رہا ہے۔ استاد کلاس میں پڑھا رہا ہے۔ بچے گیند کھیل رہے ہیں۔ زاہد آیا۔ رشید کھانا کھا رہا ہے۔ شاکر کل چلا گیا۔ دھوبی کپڑا دھو رہا ہے۔

ان جملوں میں خط کشیدہ الفاظ فاعل ہیں۔

4.6.4.2 مفعول

کسی بھی کام کرنے والے کا اثر جس پر پڑتا ہے اسے مفعول کہتے ہیں۔ یعنی کام کرنے میں کیا چیز مددگار ہے۔ جیسے حامد کتاب پڑھ رہا ہے۔ یہاں حامد کے پڑھنے کا تعلق کتاب سے ہے اس لیے کتاب مفعول ہے۔

مثال: ٹرین پٹری پر جا رہی ہے۔ رشیدہ کھانا کھا رہی ہے۔ درزی کپڑے سیتا ہے۔ شاہد سائیکل چلا رہا ہے۔ مایا نے کھلونے بنائے۔ بھائی جان گھڑی لائے۔ ملاح ناؤ چلا رہا ہے۔ روزی نے گانا گایا۔

اوپر لکھے جملوں میں خط کشیدہ الفاظ مفعول ہیں۔

4.6.5 تمیز

تمیز سے مراد وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو کسی اسم یا فقرے سے شک یا ابہام رفع کریں۔ مثلاً

واقعی وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔ اس جملے میں ''واقعی'' لفظ تمیز ہے۔

4.6.6 حرف

حرف ایسا کلمہ ہے جو اپنے آپ میں کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن جملے پورے کرنے اور بامعنی بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ یہاں پر سے اور تک کے اپنے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن ان کے استعمال کے بغیر کوئی جملہ بامعنی یا مکمل نہیں ہوتا۔

حرف کی قسمیں: حرف جار۔ حرف عطف۔ حرف ندا۔ حرف ندبہ۔ حرف شرط علت جزا۔ حرف بیان۔ حرف استثنا۔ حرف فجائیہ

(الف) حرف جار

وہ کلمہ ہے جو اسم اور فعل کے درمیان تعلق قائم کرے اور اسم اور اسم کے درمیان تعلق قائم کرے۔ جیسے

شاہد امریکہ سے آیا ہے۔ یا ساجد پر شاکر کے ہزار روپے باقی ہیں۔

یہاں پہلے جملے میں اسم اور فاعل کے درمیان ''سے'' نے جملہ پورا کیا اور دوسرے جملے میں ''پر'' ساجد اور شاکر کے درمیان آ کر جملہ پورا کرتا ہے۔ یعنی اسم اور اسم کے درمیان ''پر'' نے جملہ پورا کیا۔

(ب) حرف عطف

حرف عطف وہ ہیں جو دو الگ الگ جملوں کو یا لفظوں کو ملا کر با معنی بناتے ہیں۔ جیسے راحت اسکول سے آیا اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ رام اور شیام بہت اچھے دوست ہیں۔ صبح و شام سیر کرنا صحت کے لیے مفید ہے۔

یہاں ''و'' اور ''اور'' حرف عطف ہے جو دو الگ الگ لفظوں کو ملا کر با معنی جملہ بناتے ہیں۔

(ج) حرف ندا

حرف ندا کسی کو پکارنے یا مخاطب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے لیکن جملے کو با معنی بنانے میں معاون ہوتا ہے۔

جیسے۔ اے تم کیا کر رہے ہو۔ اوہ اللہ تیرا ہی سہارا ہے۔ ارے تم تو کچھ بول ہی نہیں رہے ہو۔ یہاں ''اے'' اوہ اور ارے کے اپنے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن اوہ اللہ تیرا..... اے تم کیا کر رہے ہو۔ اور ارے تم تو کچھ بول ہی نہیں رہے ہو کو با معنی بناتے ہیں۔ یہاں اے۔ اوہ اور ارے حرف ندا ہیں۔

(د) حرف ندبہ

وہ کلمہ ہے جس کے استعمال سے رنج و افسوس کا اظہار ہوتا ہو۔ جیسے اُف چوٹ لگ گئی۔ ہائے یہ کیا ہوا۔ آہ یہ کیسی خبر ہے۔

یہاں اُف۔ ہائے اور آہ کے الگ اپنے کوئی معنی نہیں ہیں۔ جب تک جملے میں نہ جوڑے جائیں۔ اور یہ جملوں میں جڑ کر انہیں پُر اثر بنا دیتے ہیں۔

(ہ) حرف شرط، علت و جزا

یہ وہ کلمہ ہے جس کے استعمال سے جملے کے دو حصوں کے درمیان سبب، شرط اور جزا کو قائم کر کے جملہ پورا ہو جاتا ہے۔ جیسے روشن فیل ہو گیا۔ کیونکہ اس نے محنت نہیں کی تھی۔ رضیہ نے جھگڑا کر لیا۔ صبر کرتی تو فائدے میں رہتی۔ تم نے محنت کی اس لیے اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ شاکر بہت تیز بھاگا تب فرسٹ آیا۔

یہاں کیونکہ۔ تو۔ اس لیے۔ تب کے اپنے کوئی مطلب نہیں ہیں لیکن جملے کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے یہ حرف ضروری ہیں۔

(و) حرف بیان

حرف بیان وہ کلمہ ہے جس کے بعد کوئی فقرہ بطور بیان آئے جیسے کسی نے بتایا کہ جمیل لندن گیا۔ راحت نے بتایا کہ گاڑی بہت لیٹ تھی۔ کبھی کبھی حرف بیان یعنی ''کہ'' کو استعمال نہیں بھی کرتے ہیں لیکن اس کی موجودگی مان لی جاتی ہے۔

(ز) حرف استثناء

اس کلمہ کو کہتے ہیں۔ جو ایک یا ایک سے زیادہ چیزوں یا لوگوں کو ایک یا ایک سے زیادہ چیزوں یا لوگوں سے الگ کرے۔ شاکر کے علاوہ سب چلے گئے۔ سلطان کے بجز سب نے سبق یاد کر لیا۔ تمہارے سوا اور کوئی ایسا نہیں کرتا یہاں علاوہ، بجز، سوا نے ایک چیز یا شخص سے دوسرے کو الگ کیا ہے۔ اسے حرف استثنا کہتے ہیں۔

(ح) حرف فجائیہ

یہ ایسے کلمے ہیں جو کسی خاص جذبہ، جوش، تعجب و حیرت کی حالت میں زبان سے ادا ہو جاتے ہیں جیسے سبحان اللہ کیا خدا کی شان ہے۔ توبہ توبہ یہ کیا کیا۔ شاباش حامد شاباش۔ مرحبا خوب کہا۔

یہ وہ کلمے ہیں جو جوش تعجب اور حیرت کی حالت میں بولے جاتے ہیں:

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

5. کلمہ کی کتنی قسمیں ہیں؟

6. اسم کی کتنی قسمیں ہیں؟

7. نینی تال، لکھنؤ، تاج محل کا تعلق اسم کی کس قسم سے ہے؟

8. میرے کلاس میں بیس طالب علم ہیں۔ اس میں کس صفت کا استعمال ہوا ہے؟

9. ضمیر کسے کہتے ہیں؟

10. ضمیر کی تین صورتیں کون کون سی ہیں؟

4.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اردو قواعد کے اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ جتنا ہم ان نکات کو توجہ سے پڑھیں اور سمجھیں گے اتنی ہی بہتر زبان ہم لکھ یا بول سکیں گے۔ قواعد زبان کو سیکھنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے لوگ باتیں کرنے میں کبھی مذکر مونث کی غلطی کر جاتے ہیں۔ کبھی واحد جمع کی اور کبھی فعل کی۔ لیکن اگر کسی کو قواعد کی یہ بنیادی باتیں معلوم ہیں جن کا ذکر اس اکائی میں کیا گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اردو بولنے یا لکھنے زبان کی غلطی نہیں کر سکتا ہے۔ اس اکائی میں ہم نے حرف۔ لفظ۔ جملے۔ بامعنی جملے بے معنی جملے۔ اسم۔ صفت۔ ضمیر۔ فعل۔ حرف۔ فاعل۔ مفعول سب سے بحث کی ہے اور آسان مثالیں دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے تا کہ آپ اسے یاد رکھ سکیں۔

زبانیں حروف سے بنتی ہیں۔ اردو بھی اس سے مستثنا نہیں ہے۔ اردو میں حروف تہجی کی کل تعداد 46 قرار پاتی ہے۔ حروف کے ساتھ اعراب کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ الفاظ کو صحیح پڑھنے اور بولنے کے لیے اردو میں اعراف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ حروف کو ملا کر لفظ بنتا ہے۔ لفظ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے معنی ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ پہلے کو کلمہ اور دوسرے کو مہمل کہتے ہیں۔ جملہ حروف کی تیری منزل ہے یعنی حروف سے لفظ بنے اور لفظوں سے مل کر جملے بنے۔ جملے کے دو حصے ہوتے ہیں۔ مبتدا اور خبر۔ مبتدا یعنی جس کا ذکر کیا جائے۔ خبر جو شخص یا شئے مذکور کے تعلق سے کہا جائے۔ مثلاً ہلدوانی میں نمائش لگی ہے۔ اس میں ''ہلدوانی'' مبتدا ہے

اور ''نمائش لگی ہے'' خبر ہے۔

کلمے کی چھ قسمیں ہوتی ہیں۔(1)اسم (2)صفت (3) ضمیر(4) فعل (5) تمیز(6) حرف

کسی شخص پیشے یا جگہ کا نام اسم کہلاتا ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں (1)اسم معرفہ (2)اسم نکرہ۔صفت کسی شخص یا شئے یا مقام کے تعلق سے کسی خوبی' خرابی' اچھائی یا برائی کو ظاہر کرتی ہے۔ضمیر وہ کلمہ ہے جو اس کی جگہ پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً میں' وہ' تم' اس کا' میرا وغیرہ۔کلمہ کی چوتھی قسم فعل ہے۔یہ وہ کلمہ ہے جس سے کسی کام کا ہونا یا کرنا ظاہر ہو اور یہ بھی ظاہر ہو کہ یہ کام کب اور کس زمانے میں ہوا' ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔جس سے یہ کام ہوا ہے اسے فاعل کہتے ہیں۔ کام کا اثر جس پر واقع ہوا سے مفعول کہتے ہیں۔مثلاً احمد نے کتاب پڑھی۔میں احمد فاعل' کتاب مفعول اور پڑھی فعل ہے۔کلمے کی ایک قسم تمیز بھی ہے۔تمیز سے مراد وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو کسی اسم یا فقرے سے شک یا ابہام رفع کریں۔ حرف کلمے کی آخری قسم ہے۔حرف وہ ہے جو اپنے آپ میں کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن جملے پورے کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔مثلاً سے' پر' تک وغیرہ۔

مجھے امید ہے کہ اس اکائی پر عمل کرنے کے بعد آپ اچھی اور صحیح زبان لکھ اور بول سکیں گے۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 کلمہ کسے کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

2 معنی کے لحاظ سے فعل کی قسمیں بتائیے اور اس کی مثالیں دیجیے۔

3 حرف علت سے کیا مراد ہے؟ اور کن حروف کو حروف علت کہتے ہیں؟

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 جملے کے دو عناصر کون کون سے ہیں؟ تشریح کیجیے۔

.2 صفت کسے کہتے ہیں اس کی قسمیں لکھیے اور مثالیں لکھیے۔

3. حروف ندا اور حروف ندبہ کی تعریف کیجیے اور مثالیں دیجیے۔

4.9 فرہنگ

متعارف	تعارف کرانا
مہمل	جس کے کوئی معنی نہ ہوں
سہولت	آسان
عناصر	حصے۔ جز

4.10 معاون کتابیں

1. مولوی عبدالحق — اردو قواعد
2. عصمت جاوید — نئی اردو قواعد
3. مولوی عبدالحق — مختصر قواعد اردو۔ حصہ اول، حصہ دوئم

4.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. حروف کے مجموعے کو لفظ کہتے ہیں۔ 2. کلمہ
3. الفاظ سے جملہ بنتا ہے۔ 4. مبتدا اور خبر
5. کلمے کی چھ قسمیں ہیں۔ (1) اسم (2) صفت (3) ضمیر (4) فعل (5) تمیز (6) حرف
6. اسم کی دو قسمیں ہیں (1) اسم معرفہ (2) اسم نکرہ
7. اسم معرفہ 8. صفت عددی کا استعمال ہوا ہے۔
9. اسم کی جگہ استعمال ہونے والے لفظ کو ضمیر کہتے ہیں۔
10. ضمیر متکلم، ضمیر حاضر، ضمیر غائب۔

اکائی 5: مذکر، مونث، واحد، جمع، متضاد، مترادف

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 جنس

5.3.1 مذکر

5.3.2 مونث

5.4 تعداد

5.5 متضاد

5.6 مترادف

5.7 خلاصہ

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

5.9 فرہنگ

5.10 معاون کتابیں

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد زبان اور قواعد کے سلسلے میں بعض نکات مثلاً مذکر ومونث واحد وجمع اور متضاد ومترادف وغیرہ کو سمجھنا ہے۔ زبان میں ایسے بہت سے لفظ آتے ہیں جن کے بارے میں پریشانی ہوتی ہے کہ وہ جمع ہیں یا واحد، مذکر ہیں یا مونث۔ اس اکائی میں ان کے بعض اصولوں کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ الفاظ کے استعمال میں اس

طرح کی غلطی نہ ہو۔ زبان یوں تو ہم ماں کی گود سے بولنا سیکھ جاتے ہیں اسی لیے اسے مادری زبان کہتے ہیں لیکن صحیح زبان جاننے اور لکھنے کے لیے بہت سی چیزوں اور اصولوں کو سمجھنا ہوتا ہے۔ اس اکائی میں انہیں اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔

5.2 تمہید

زبان سے متعلق بعض بنیادی باتوں کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ ان بنیادی باتوں میں قواعد اور اس کے نکات سے واقفیت سب سے زیادہ ضروری ہے کیوں کہ واحد و جمع اور تذکیر و تانیث یعنی مذکر و مونث سے واقف ہونا' زبان سیکھنے کے اولین مرحلوں میں سے ایک ہے۔ ہر زبان کم و بیش اسی طرح کے مسائل رکھتی ہے گو کہ ان کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ بعض زبانوں جیسے بنگلہ میں تذکر و تانیث ہوتی ہی نہیں لیکن اردو میں اس کی بڑی اہمیت ہے بلکہ اس کے بارے میں بڑی دلچسپ بحثیں رہی ہیں۔ دہلی والے کسی لفظ کو مذکر بولتے ہیں لکھنو والے اسی کو مونث کہتے ہیں۔ اس لیے اس کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح تعداد یعنی واحد اور جمع یا مترادف اور متضاد کا مسئلہ ہے۔ ان بنیادی باتوں کو جانے بغیر زبان کو سمجھنے کا عمل پورا نہیں ہوتا۔ ذیل میں ہم انہی اہم نکات پر گفتگو کریں گے۔

5.3 جنس

جنس سے مراد اسماء کی تذکیر و تانیث ہے یعنی جسے ہم عام زبان میں نر اور مادہ کہتے ہیں۔ لیکن بعض آریائی زبانوں میں جنس کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو بے جان اشیا سے متعلق ہے۔ لیکن اردو' ہندی' پنجابی اور سندھی زبانوں میں صرف دو ہی قسمیں ہیں۔ یعنی مذکر و مونث ان زبانوں میں جاندار اور بے جان سب ہی میں تذکیر و تانیث کا لحاظ ہوتا ہے۔

5.3.1 مذکر

اردو میں تذکیر و تانیث کے لیے کوئی عام کلیہ نہیں ہے۔ لیکن کچھ اصول ہیں جن سے مذکر اور مونث کی پہچان

ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض ایسے الفاظ جن کے آخر میں ''الف'' آتا ہے وہ مذکر ہوتے ہیں۔ مثلاً

1. گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہے۔
2. آج کا لڑکا محنت سے ڈرتا ہے۔
3. گھڑا گر کر ٹوٹ گیا۔

ان جملوں میں گھوڑا۔ لڑکا۔ گھڑا مذکر ہیں۔ اسی طرح الف پر ختم ہونے والے دوسرے الفاظ مثلاً گورا۔ بکرا۔ کیلا۔ پیلا۔ چھرا۔ کپڑا۔ ڈنڈا وغیرہ سب مذکر ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی میں اکثر وہ لفظ بھی مذکر میں آ جاتے ہیں۔ جن کے آخر میں الف 'ہ' یعنی ہائے ہوز ہوتی ہے۔ جیسے بندہ۔ خواجہ۔ سقہ، حقہ۔

5.3.2 مونث

مونث یعنی مادہ اس کے لیے مذکر میں الگ لگ حروف مثلاً ی' ن' یا' ہ لگا کر مونث بنا لیتے ہیں۔ جیسے بوڑھا سے بڑھیا' مالی سے مالن' مرغا سے مرغی' والد سے والدہ وغیرہ۔

آیئے اب ہم اس کی چند مثالوں پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ کس طرح کے الفاظ یا اسماء میں کس تبدیلی یا اضافے سے اس اسم یا شئے کی مونث بن جائے گی۔ نیچے لکھے جملوں کو ایک بار پڑھیے:

1. کوئل ایک چڑیا کا نام ہے۔
2. بے چاری بڑھیا سڑک پر گر پڑی۔
3. دیکھ بندریا کیسا ناچ رہی ہے۔
4. میری والدہ کل الہٰ آباد سے واپس آئی ہیں۔

جن الفاظ کے آخر میں یائے معروف (ی) ہوتی ہے۔ وہ سب نہیں لیکن عام طور پر مونث ہوتے ہیں۔ جیسے بی بی۔ لڑکی۔ گھوڑی۔ چوڑی۔ روٹی لیکن جیسا کہ آپ کو پہلے ہی بتایا گیا کہ ہر اسم یا شے پر یہ عمل عائد نہیں ہوتا مثلاً آپ ہاتھی کو مونث نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح بعض پیشہ وروں کے نام جن کے آخر میں ''ی'' ہوتی ہے اس سے مستثنیٰ

ہیں۔جیسے مالی، دھوبی، گھوسی، تیلی، پجاری وغیرہ یہ سب مذکر ہیں۔

(الف) ان ہی پیشہ وروں کے نام کے آخر میں ی (یائے معروف) کو اگر 'ن' سے بدل دیا جائے تو یہ مونث ہو جاتے ہیں۔جیسے دھوبن، گھوسن، تیلن، پجارن، منہارن، نائن، کہارن، میراثن وغیرہ جیسے

1. منہارن چوڑی پہنانے آئی تھی۔
2. دھوبن کپڑے لے کر چلی گئی۔
3. پجارن پوجا کے پھول لائی۔

(ب) ی، یا، ن سے تذکیر و تانیث کا قاعدہ ہر جگہ عائد نہیں ہوتا۔بعض جگہوں پر مذکر اور مونث کے لیے الگ الگ الفاظ ہوتے ہیں۔جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ مذکر اور مونث کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً ان جملوں کو دیکھیے۔

1. باپ اور ماں کی محبت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہے (باپ (مذکر) ماں (مونث)
2. غلام اور باندی رکھنے کا زمانہ اب نہیں رہا۔(غلام (مذکر) باندی (مونث)

اس طرح کے اور بہت سے الفاظ ہو سکتے ہیں:

میاں	بی بی
بیل	گائے
نواب	بیگم

(ج) اب تک ہم نے تذکیر و تانیث کی کئی صورتیں دیکھیں بعض وقت ذرا سی تبدیلی سے جنس بدل جاتی ہے۔مثلاً کبھی مختلف علامات کے ساتھ بہت آسانی سے مذکر اور مونث بدل جاتے ہیں۔اگر مذکر کے آخر کا ''الف'' یا ''ہ'' ہٹا کر ''ی'' (معروف) آ جائے تو جنس بدل کر مونث بن جائے گی۔جیسے:

لڑکا	لڑکی	شاہزادہ	شاہزادی

بیٹا	بیٹی	لنگڑا	لنگڑی
بچھڑا	بچھڑی	بھانجا	بھانجی
مرغا	مرغی	چیونٹا	چیونٹی
چچا	چچی	گولا	گولی

اوپر کے الفاظ کو اگر آپ غور سے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ان میں آخری حرف ''الف'' کو ہٹا کر ''ی'' لگانے سے تانیث بن گئی ہے۔ اب کچھ ایسے اسم پیش ہیں جن میں بغیر کسی تبدیلی کے صرف ''ی'' معروف کا اضافہ کر دینے سے تذکیر تانیث میں بدل گئی ہے۔ جیسے:

پٹھان	پٹھانی
ہرن	ہرنی
تیتر	تیتری

(د) بعض اسماء میں آخری حروف کو ''ن'' سے بدل دینے یا آخری حروف کے آگے ''ن'' بڑھا دینے سے تانیث بن جاتی ہے۔ جیسے مراٹی کی ''ی'' کو ہٹا کر اگر آپ ''ن'' لگا دیں تو وہ مونث بن جائے گی۔ اس کی چند اور مثالیں نیچے درج ہیں۔

مراٹی	مراٹن	جوگی	جوگن
نائی	نائن	مالی	مالن
چودھری	چودھرائن	ناگ	ناگن
فقیر	فقیرن	دولھا	دلھن
دھوبی	دھوبن		

(ہ) کبھی آخری حرف کو حذف کر کے یا بلا حذف کیے ''بی'' یا ''انی'' کے اضافے سے اس اسم کی تانیث بن جاتی

ہے مثلاً اگر آپ ''مُلا'' میں ''نی'' کا اضافہ کردیں یا دیور میں ''انی'' کا اضافہ کردیں تو ملا کی تانیث ملانی اور دیور کی تانیث دیورانی بن جائے گی۔ اس طرح کے بہت سے اسماء اور ان کی تانیث کا استعمال ہم صبح سے شام تک اپنی گفتگو میں کرتے ہیں۔ مثلاً

ڈاکٹر	ڈاکٹرنی	ڈوم	ڈومنی
شیر	شیرنی	اونٹ	اونٹنی
مغل	مغلانی	پنڈت	پنڈتانی

(و) تذکیر اور تانیث کے سلسلے میں اب تک اسم نکرہ یعنی عام ناموں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ بعض اوقات اردو میں اسم خاص یعنی اسم معرفہ سے بھی مونث بنالیا جاتا ہے۔ جیسے کریم اسم معرفہ ہے اس کی تانیث کریمن بنالی گئی۔ اس طرح کے بہت سے نام آپ نے سنے ہوں گے۔ ان کی چند مثالیں نیچے درج ہیں:

امیر	امیرن	رحیم	رحیمن
شبراتی	شبراتن	نور	نورن
مراد	مرادن	نصیب	نصیبن

اس طرح آپ نے دیکھا کہ تذکیر و تانیث کے سلسلے میں مختلف طریقے رائج ہیں اور مختلف اسما کی تانیث آسانی سے بنالی جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے لیے کوئی ایک متعین قاعدہ نہیں ہے۔ لیکن تھوڑی سی توجہ سے دیکھنے پر یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کسی اسم کو مونث کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. عام طور پر مذکر کی کیا پہچان ہے؟
2. کس طرح کے اسماء میں ن لگنے سے اس کی تانیث بن جاتی ہے؟

3. پٹھان، جوگی، شہزادہ کی تانیث کیا ہوگی؟

5.4 تعداد

جب ہم اپنی گفتگو میں کسی اسم یا چیز کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے ساتھ اس کی تعداد کا بھی خیال آتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ:

1. تصویر دیوار پر لگی ہے۔
2. پنکھا تیزی سے چل رہا ہے۔
3. کرسی پر ماسٹر صاحب بیٹھے ہیں۔
4. میز پر گلدستہ رکھا ہے۔
5. لڑکی کھانا پکا رہی ہے۔

ان جملوں میں کہیں بھی تعداد کا ذکر نہیں ہے لیکن تصویر، پنکھا، کرسی، گلدستہ اور لڑکی کے ذہن میں آتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک تصویر، ایک پنکھا، ایک کرسی، ایک گلدستہ اور ایک لڑکی ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے۔

1. لڑکیاں اسکول گئیں۔
2. چائے کی پالیاں میز پر رکھی ہیں۔
3. میں آج کتابیں خرید کر لایا ہوں۔

تو لڑکیاں، پیالیاں اور کتابیں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سے زائد ہیں۔ اس لیے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کوئی چیز ایک ہے تو وہ ''واحد'' کہلاتی ہے اور اگر ایک سے زیادہ ہے تو اسے ''جمع'' کہتے ہیں۔

اس طرح تعداد یا گنتی کے اعتبار سے اسم کی دو قسمیں ہوئیں۔ ''واحد'' اور ''جمع''

1. واحد: وہ اسم ہے جس سے کسی ایک چیز کا ہونا سمجھا جائے جیسے لڑکا، گھوڑا، ریل، کتاب، وغیرہ۔

2. جمع: جمع وہ اسم ہے جس سے ایک سے زیادہ چیزوں کا علم ہو جیسے کاپیاں، کرسیاں، لڑکے، عورتیں، وغیرہ۔ ویسے یہ ہمیں بہت آسان لگتا ہے ایک اور ایک سے زیادہ کی پہچان کون نہیں کر سکتا۔ اس لیے جہاں ایک کا اشارہ ہو وہ واحد اور جہاں ایک سے زیادہ کا اشارہ ہو وہ جمع ہے۔ لیکن تعداد کا مسئلہ اس سے آگے بھی ہے اور اسے سمجھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ذیل میں اس پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

(الف) ایک بہت دلچسپ بات کہ ہم بعض چیزوں میں بات تو ایک کی کرتے ہیں لیکن اس سے مراد ایک سے زیادہ کے ہوتے ہیں۔ مثلاً نیچے دیے گئے جملوں کو پڑھیے۔

1. کل نمائش سے میں نے ایک جوڑ موزا خریدا۔
2. وہ تمہارے لیے درجن بھر کیلے لایا ہے۔
3. رشید ایک ہفتہ کے لیے باہر جا رہا ہے۔
4. بس عشرے بھر ہی کی تو بات ہے میں کام ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔

اب اس میں دیکھیے ہر چیز ایک ہے۔ ایک جوڑ، ایک درجن، ایک ہفتہ، ایک عشرہ لیکن اس کا مطلب ایک سے زیادہ ہے۔ ایک جوڑ کا مطلب دو، ایک درجن کا مطلب بارہ، ایک ہفتہ کا مطلب سات دن، ایک عشرے کا مطلب دس دن۔ اسی طرح کبھی شمار کے علاوہ گنتی کی کئی اشیاء ساتھ استعمال ہوئی ہیں لیکن وہ ہمیشہ واحد ہی رہتی ہیں۔ جیسے:

تین منزلہ مکان، دس نفر مزدور، یہ مکان کئی منزلہ ہے۔ مزدور بھی دس ہیں لیکن مکان اور مزدور کا استعمال واحد ہی میں رہے گا۔

(ب) ایک بات یہاں پر آپ کو یاد رکھنی چاہیے کہ اردو کو تہذیب کی زبان کہا جاتا ہے یا اردو زبان کی ایک تہذیب ہے۔ اس تہذیب کا اندازہ اس کے بولنے اور سننے ہی سے ہوتا ہے۔ واحد اور جمع کے استعمال میں بھی اس کی تہذیب کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً اردو میں کسی کی تعظیم یا اس کی عظمت کے اظہار میں اس کے لیے واحد کے بجائے جمع استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

1. آپ کے والد کب آ رہے ہیں؟

2. حضرت ہمارے بزرگ ہیں۔

3. جناب عالی کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

ان جملوں میں والد، حضرت، جناب عالی سب واحد ہیں لیکن ان کی بزرگی اور بڑائی کے لیے جمع کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ تعداد میں جمع ہیں لیکن استعمال واحد میں ہوتے ہیں۔ آپ نے یہ شعر ضرور پڑھا ہوگا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اب اس میں دیکھیں کہ ہزار ہا شجر جمع ہے لیکن اس کے ساتھ فعل واحد استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی اور بھی کئی مثالیں ہیں لیکن ان کا واحد میں استعمال بھی غلط نہیں ہے جیسے:

1. ہزار ہا مکان جل گیا — ہزار ہا مکان جل گئے

2. صد ہا تماشائی موجود تھا — صد ہا تماشائی موجود تھے

3. قحط میں سینکڑوں جانور مر گیا — قحط میں سینکڑوں جانور مر گئے۔

یہ جمع کے لیے واحد استعمال کیے جانے کی مثالیں تھیں لیکن واحد کے لیے جمع کا استعمال بہت ہے اور ہم ایسے الفاظ کے استعمال کے وقت شاید اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ مثلاً ان جملوں کو دیکھیے۔

1. اس کتاب کے کیا دام ہیں۔

2. اس کے بھاگ جاگ گئے۔

3. تمہارے کرتوت اچھے نہیں ہیں۔

4. اس کے کرم پھوٹ گئے۔

5. لاٹری کیا نکلی اس کے تو نصیب جاگ اٹھے۔

6. دنیا میں رہنے کے یہ لچھن نہیں ہیں۔

7. بہت دنوں سے آپ کے درشن نہیں ہوئے۔

8. سانپ کو دیکھ کر اس کے تو اوسان خطا ہو گئے۔

ان میں کتاب، بھاگ، کرتوت، کرم، نصیب، لچھن، درشن، اوسان سب واحد ہیں لیکن ان جملوں میں یہ سب جمع میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس میں غلط اور صحیح کی بات نہیں اس سے اظہار زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(ج) واحد اور جمع کے سلسلے میں آپ کو ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ جمع صرف اسم نکرہ کی بن سکتی ہے۔ اسم معرفہ کی جمع نہیں بنتی اس لیے کہ معرفہ کا مطلب اسم خاص یا خاص نام ہے اور وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً لکھنؤ، نینی تال، الموڑہ، خالدہ، ارم، حنا، ہمالیہ، تبت وغیرہ اور اسم نکرہ ایک سے زائد ہو سکتے ہیں۔ کتاب / کتابیں، کرسی / کرسیاں، شیر / شیروں، آدمی / آدمیوں، عورت / عورتوں، پہاڑ / پہاڑوں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. تعداد سے کیا مراد ہے؟

5. ایک سے زائد کو قواعد کی رو سے کیا کہتے ہیں؟

6. دو ایسے اسم جو واحد ہوں اور جمع بولے جائیں۔

5.5 متضاد

ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں اکثر ایسے کلمے استعمال کرتے ہیں جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے بالکل مختلف ہوتے ہیں لیکن معنی پر ان کا کوئی فرق نہیں پڑتا اور کہنے والا جو کہہ رہا ہے وہ بات پوری طرح سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جیسے:

راشد نے رات دن محنت کر کے یہ کتاب پوری کر دی۔

یہاں پر رات کے بالکل مخالف دن ہے بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن جملہ اپنی ساخت کے لحاظ سے مکمل اور بامعنی ہے۔

(الف) متضاد اس کلمہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کلمہ کی ضد ہو جیسے اندھیرا' اجالا' رات' دن وغیرہ۔ اس طرح کے متضاد کلمات ہماری گفتگو میں اکثر آتے ہیں۔ کبھی کسی چیز کی اہمیت کے اظہار کے لیے متضاد کلمات استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی کسی بات پر زور دینے کے لیے متضاد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً

1. ہار جیت کا خوف کیے بغیر مقابلہ کرنا بہادری ہے۔
2. اس نے اس کام کو مکمل کرنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیا۔
3. انسان کا کردار اچھا ہو تو خوبصورتی اور بدصورتی کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔
4. پاس فیل ہونا قسمت پر نہیں اپنی کوشش پر منحصر ہے۔

ان جملوں میں دیکھیے کہ اگر کلمہ کے ساتھ اس کا متضاد نہ استعمال کیا جاتا تب بھی بات پوری ہو جاتی اور سمجھ میں آتی لیکن بات میں وہ اثر اور زور نہ پیدا ہوتا جو متضاد کے استعمال کے ساتھ پیدا ہوا۔

(ب) متضاد کلمات اسم اور صفت دونوں میں ہوتے ہیں لیکن عام طور پر صفت سے متضاد کا اظہار زیادہ کیا جاتا ہے۔

مثلاً خوبصورتی و بدصورتی ہار اور جیت

سیاہ و سفید جھوٹ اور سچ

خوشی اور غم

اس طرح صفت میں متضاد کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی جو گفتگو میں برابر سننے میں آتی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں درج ذیل جملوں کو غور سے پڑھیں۔

1. اس کی نگاہ میں امیر و غریب سب برابر ہیں۔
2. دوست اور دشمن تو ہر ایک کے ہوتے ہیں۔

3. مجھے اللہ پر بھروسا ہے میرے لیے خیر خواہ اور بدخواہ کی کوئی اہمیت نہیں۔

ان جملوں میں امیر و غریب، دوست اور دشمن، خیر خواہ اور بدخواہ اسم ہیں۔ متضاد صفتی ہو یا اسمی اس سے معنی یا اس کے مقصد میں کوئی فرق نہیں ہوتا اس لیے ضرورت کے مطابق زبان میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. متضاد کسے کہتے ہیں؟

8. صفتی متضاد سے کیا مراد ہے؟

9. زبان میں متضاد کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے؟

5.6 مترادف

اکثر ہم اپنی گفتگو کو پر اثر یا زوردار بنانے کے لیے ایسے کلمات استعمال کرتے ہیں جو ہم معنی ہوتے ہیں۔ ان ہم معنی الفاظ سے زبان کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے جس زبان میں جتنے زیادہ ہم معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ اتنا ہی اس زبان کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ اردو زبان اس معاملے میں وسیع مترادفات کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ عام طور پر زبانوں میں تخاطب کے لیے ایک یا دو لفظ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے You کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو بڑے اور چھوٹے سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اردو میں ہر درجے اور ہر مرتبے کے لوگوں کے تخاطب کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔

برابر والے کے لیے تم کا استعمال ہوتا ہے

بڑے کے لیے آپ

بزرگ کے لیے جناب، حضرت اور حضور

ادنیٰ اور چھوٹے کے لیے کبھی تو کا استعمال

اسی طرح سلام کے لیے کسی زبان میں ایک دو الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ انگریزی میں تو صبح، شام اور رات کے الفاظ لگا دیے جاتے ہیں۔ عربی میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ ہندی میں نمستے یا جے رام جی کی کا عام استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں مخاطب کے لحاظ سے سلام کا کلمہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

آج کل عام رواج السلام وعلیکم کا ہے لیکن اس کے علاوہ جو کلمات یا جتنے کلمات سلام کے سلسلے میں اردو میں استعمال ہوئے ہیں کسی دوسری زبان میں نہیں ہیں۔ مثلاً

آداب، سلام، تسلیم، بندگی، سلام علیکم

یہ زبان کی تہذیبی امارت کی ایک مثال ہے۔ اب آیئے مترادف کی تعریف اور اس کی مثالوں پر غور کریں۔

مترادف ان الفاظ یا کلمات کو کہتے ہیں جو ہم معنی ہوتے ہیں اور زبان میں زور و اثر کے اظہار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

یہاں پر مترادف کلمات کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

1. وہ لڑکی بہت ہی حسین و جمیل ہے۔
2. اکبر نے حمید سے کہا کہ بھائی کبھی تو بھولے بھٹکے ادھر بھی آ جایا کرو۔
3. حامد شکل و صورت سے تو بہت شریف لگتا ہے۔
4. اس کے حسن کی کیا تعریف کی جائے اس کے سامنے تو مہ و ماہ شرمندہ ہو جائیں۔
5. رشید کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل ہے۔
6. ہمارے تہوار مسرت و خوشی کی علامت ہیں۔

زبان میں زور پیدا کرنے کے لیے کبھی مترادف کے طور پر اس لفظ کو دوبارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ کی یہ تکرار جملہ میں زور و اثر پیدا کرتی ہے۔ مثلاً

1. وہ اپنی بات منوانے کے لیے زور زور سے چیخ رہا تھا۔

2. وہ لاکھ جلدی جلدی چلا پھر بھی اس کی ٹرین چھوٹ گئی۔

3. بار بار کسی سے مدد مانگنا اچھا نہیں لگتا۔

اس طرح بہت سے مترادف الفاظ ہیں جو استعمال کیے جاتے ہیں۔شور وغل' بلند وبالا' شان وشوکت' آہ وبکا' چیخ وپکار جیسے سینکڑوں مترادفات ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. مترادف کسے کہتے ہیں؟

11. زبان میں مترادف کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

12. مترادف اور تکرار میں کیا فرق ہے؟

5.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے زبان میں مذکر' مونث' واحد' جمع' متضاد و مترادف کا مطالعہ کیا اور ان کے اصولوں کو سمجھا۔جنس' تعداد اور متضاد و مترادف' زبان کی بنیادی باتیں ہیں جن کی زبان میں بڑی اہمیت ہے۔

آیئے سب سے پہلے ''جنس'' پر غور کرتے ہیں۔جنس سے مراد اسماء کی تذکیر و تانیث ہے۔یعنی جسے ہم عام زبان میں ''نر'' اور ''مادہ'' کہتے ہیں۔تذکیری یعنی مذکر اسما 'لڑکا' گھوڑا' لوٹا وغیرہ ہیں۔تانیثی یعنی مونث اسماء مثلاً لڑکی گھوڑی' بڑھیا وغیرہ ہیں۔تذکیر یا مذکر کی عام پہچان الف پر ختم ہونے والے الفاظ ہیں۔مثلاً لڑکا۔لیکن 'ہ' پر بھی ختم ہونے والے تذکیری اسماء ہیں مثال کے طور پر بندہ' حقہ وغیرہ۔''ی'' پر بھی تذکیر یا مذکر اسما ختم ہوتے ہیں۔مثلاً آدمی' درزی' فوجی وغیرہ۔تانیث بنانے کا عام قاعدہ یہ ہے کہ تذکیری اسماء کے آخر میں 'ہ' 'ی' 'ن' 'ی وغیرہ لگا کر تانیثی اسما بنا لیتے ہیں۔مثلاً والد سے والدہ' بیٹا سے بیٹی' دھوبی سے دھوبن' بوڑھا سے بوڑھیا وغیرہ۔اس کے علاوہ تذکیری و تانیثی اسما ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی ہوتے ہیں۔مثلاً بیل' گائے' آدمی' عورت وغیرہ۔

جب ہم اپنی گفتگو میں کسی اسم یا چیز کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تعداد کا بھی خیال آتا ہے۔تعداد کو ہم دو حصوں

میں تقسیم کر سکتے ہیں (1) واحد یعنی صرف ایک (2) جمع یعنی ایک سے زیادہ۔ اس تعداد کا ذکر گفتگو میں کبھی راست طور پر ہوتا ہے اور کبھی ناراست طور پر۔ مثلاً (1) عابد کے گھر میں دو کمرے ہیں (2) تصویر دیوار پر لگی ہے۔

دوسرے جملے میں تعداد کا ذکر نہیں لیکن تصویر چونکہ اسم واحد ہے اس لیے مراد ایک ہی تصویر سے ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بات ایک کی کر کے مراد ایک سے زیادہ لیتے ہیں۔ مثلاً میں نے ایک جوڑا موزا خریدا۔ اس جملے میں ایک جوڑ کا مطلب ہے دو موزے۔ کبھی تعظیماً بھی واحد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب بزرگی اور بڑائی کے لیے کسی کو تعظیم دینا مقصود ہو۔ مثلاً آپ کے والد کب آ رہے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی واحد لکھ کر جمع مراد لینا اور جمع لکھ کر واحد مراد لینا بھی جائز ہے۔ مثلاً صدہا تماشائی موجود تھا۔ اس کتاب کے کیا دام ہیں۔

متضاد الفاظ کے استعمال سے گفتگو میں زور پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً رات دن وہ محنت کر کے یہاں تک پہونچا' فیل پاس ہونا قسمت پر نہیں کوشش پر منحصر ہے۔ اسی طرح اردو میں مترادف یعنی ہم معانی الفاظ کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ گفتگو میں ان کا استعمال بھی زور بیان میں اضافہ کرتا ہے۔ مثلاً وہ لڑکی بہت ہی حسین و جمیل ہے۔ تہوار مسرت و خوشی کی علامت ہیں۔ زبان کے تعلق سے یہی وہ اہم نکات ہیں کہ جن سمجھے بغیر کوئی بھی صحیح زبان نہیں بول سکتا۔ ان اصولوں کو آسان مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے جس سے آپ کو زبان کے سیکھنے میں آسانی ہوگی۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 اسم معرفہ و نکرہ میں کیا فرق ہے؟ اسم معرفہ سے مونث بنانے کا غالب طریقہ کیا ہے؟

2 جنس سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ مثالوں کے ذریعہ واضح کیجیے۔

3 متضاد کسے کہتے ہیں؟ مثالیں دیتے ہوئے واضح کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 تذکیر و تانیث کا فرق واضح کرتے ہوئے مذکر سے مونث بنانے کے طریقوں پر روشنی ڈالیے۔

2. تعداد سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کی مختلف صورتوں کو مثالوں سے سمجھائیے۔

3. متضاد اور مترادف کی زبان میں کیا اہمیت ہے۔ مثال کے ساتھ لکھیے۔

5.9 فرہنگ

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
عائد	لاگو	پیشہ ور	کوئی کام کرنے والا
مستثنیٰ	بری، علحدہ	آہ و بکا	رونا چلانا
متعین	طے شدہ	واضح	صاف
کارفرمائی	عمل، کارروائی	عظمت	بڑائی
مسافرنواز	مسافر کی خاطر کرنے والے	وسعت	پھیلاؤ، لمبائی چوڑائی
منحصر	وابستہ، متعلق، موقوف	امارت	امیر ہونا، بڑائی
مستعمل	استعمال میں		

5.10 معاون کتابیں

1. قواعد اردو — مولوی عبدالحق
2. قواعد اردو، خطوط نگاری اور مضمون نویسی — س۔ع۔س۔ نصرت پبلشرز، لکھنؤ

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. بعض الفاظ/اسماء جن کے آخر میں الف آتا ہے۔ مذکر ہوتے ہیں۔
2. بعض پیشہ وروں کے اسماء میں جیسے درزی/درزن، دھوبی/دھون، مالی/مالن وغیرہ۔
3. پٹھانی، جوگن، شہزادی
4. تعداد سے مراد واحد اور جمع ہے۔

5. جمع

6. ہزار ہا۔صد ہا

7. ایک دوسرے کی ضد؛ بالکل مخالف

8. جو کسی صفت سے تعلق رکھتے ہوں جیسے خوبصورتی ' اچھائی ' روشنی

9. زبان میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے۔

10. ہم معنی الفاظ کو مترادف کہتے ہیں۔

11. اپنے بیان کو وسعت دینے اور اس میں اثر پیدا کرنے کے لیے۔

12. مترادف ہم معنی لفظ ہے اور تکرار اسی لفظ کو دوبارہ استعمال کرنا۔

اکائی 6: محاورے اور کہاوت

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 محاورے

6.3.1 محاوروں کا نثر اور شعر میں استعمال

6.3.2 چند محاورے اور ان کے معنی

6.3.3 محاورے ب پ ت ٹ

6.3.4 چند محاورے اور ان کے معنی

6.3.5 کچھ اور محاورے

6.4 ضرب المثل یا کہاوت 6.5 خلاصہ

6.6 نمونہ امتحانی سوالات 6.7 فرہنگ

6.8 معاون کتابیں 6.9 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد زبان میں محاورے اور کہاوت (ضرب المثل) کی اہمیت کو سمجھنا ہے۔ ہر زبان میں محاوروں اور ضرب الامثال یا کہاوتوں کا وافر سرمایہ پایا جاتا ہے۔ یہ محاورے اور کہاوتیں اس زبان کے تہذیبی وسماجی پس منظر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ زبان کے مطالعے اور اس سے واقفیت کے لیے ان محاوروں اور کہاوتوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ہم روزمرہ کی گفتگو میں بعض ایسے جملے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کے وہ معنی نہیں ہوتے جو بظاہر نظر آتے ہیں مثلاً ''عید کا چاند ہونا'' عید کے چاند کا ہر شخص کو انتظار رہتا ہے اور اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن

عید سال میں ایک بار ہی آتی ہے۔ اس محاورے کو اس جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کسی سے بہت دن کے بعد ملاقات ہوئی۔ اس اکائی کے ذریعہ آپ بہ آسانی اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ محاورہ کسے کہتے ہیں۔ ضرب المثل کے معنی کیا ہیں اور کس طرح اور کہاں پر ان کا استعمال ہوتا ہے۔

6.2 تمہید

یہ بات آپ اس سے پہلے بھی پڑھ چکے ہیں کہ لفظ کے صرف ایک معنی نہیں ہوتے اگر آپ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ لفظ کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں۔ اسے آپ اصل معنی بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے اس کے اصطلاحی معنی ہوتے ہیں، یعنی کسی جگہ پر کسی لفظ کو اصل معنی کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال کیا جائے اور لوگ اسے آسانی سے سمجھ لیں تو اسے اصطلاحی معنی کہتے ہیں۔ مثلاً نسخہ کے لغوی معنی لکھا ہوا ہونے کے ہیں لیکن کتاب یا مخطوطے کی جلد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور سب بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ لفظ کا تیسرا استعمال مجازی معنوں میں ہوتا ہے اسے مرادی معنی بھی کہتے ہیں۔ مثلاً غزال کے لغوی معنی ہرن کے ہیں۔ شاعری میں اس کا استعمال بڑی آنکھوں والی محبوبہ کے لیے ہوتا ہے۔ یا سرو ایک درخت ہے جو سیدھا اور لمبا ہوتا ہے لیکن اردو شاعری میں محبوب کی دراز قامتی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جو اس کے مجازی معنی ہیں۔

6.3 محاورے

محاورہ دو یا دو سے زائد الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جو مصدر سے مل کر اصلی معنی کے بجائے مجازی معنی میں بولا جائے جیسے: دھوکا کھانا، تعریف کے پل باندھنا، تین پانچ کرنا، خون سفید ہونا، آپے سے باہر ہونا وغیرہ۔

6.3.1 محاوروں کا نثر اور شعر میں استعمال

یہاں پر حروفِ تہجی کی ترتیب سے چند محاورے نثری اور منظوم مثالوں کے ساتھ پیش ہیں۔

1. آب آب ہونا: شرمندہ ہونا

''اسے اپنی بہادری پر بڑا ناز تھا۔ آج کی شکست سے وہ آب آب ہو گیا۔''

قامت موزوں کے آگے پابہ گل شمشاد ہو

روئے رنگیں کو ترے دیکھے تو گل ہو آب آب (مومن)

2. آبرو کھونا: بے عزت ہونا' بدنام ہونا

''اس نے تو چوری کر کے اپنی آبرو کھودی''

یہ بھی اک آبرو کا کھونا تھا نام بدنام سب میں ہونا تھا (شوق لکھنوی)

3. آڑے آنا: برے وقت میں کسی کی مدد کرنا

''میں تو بالکل تباہ ہو گیا تھا اگر وہ آڑے نہ آتا تو میں کہیں کا نہ رہتا۔''

ٹل گئی غیر کے سر پر مرے سر کی آفت

میرے آڑے بخدا میری وفائیں آئیں (بحر لکھنوی)

4. آس توڑنا: ناامید کرنا' مایوس کرنا

''اس سے مجھے بڑی امید تھی لیکن اس نے میری آس ہی توڑ دی''

اتنی مدت کی آس توڑ چلے پیٹتا روتا ہم کو چھوڑ چلے (شوق لکھنوی)

5. آسمان پر چڑھنا: بے حد تعریف کرنا

''تم نے اسے ایسا آسمان پر چڑھایا کہ اس کا واقعی دماغ خراب ہو گیا۔''

بس بس چڑھا چکے تم ہمیں آسمان پر

اس سے تو خاک ہی میں ملاتے تو خوب تھا (جلال لکھنوی)

6. آسمان پر دماغ ہونا: مغرور ہونا' اپنے کو بہت بڑا سمجھنا

''جب سے وہ امتحان میں اول نمبر سے پاس ہوا ہے اس کا دماغ آسمان پر ہے۔''

برق کا آسمان پر ہے دماغ پھونک کر میرے آشیانے کو (مومن)

7. آسمان سر پر اٹھانا: دھوم مچانا' اودھم کرنا' شور وغل کرنا

''بچوں کو ذرا سی شے مل جائے تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔''

شور و شر کرتے ہیں یہ حسنِ دو روزہ پر

آسماں اہلِ زمین سر پہ اٹھا لیتے ہیں (رند)

8. آسمان سے باتیں کرنا: آسمان چھونا' آسمان کے قریب ہونا

''حامد کی پتنگ کے مقابلے میں آج سلیم کی پتنگ آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔''

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے

باتیں ہیں وہ آج آسماں سے کرتے حالی (برکھارت)

9. آفت ٹوٹنا: بلا کا نازل ہونا' ستم ٹوٹنا

''زلزلے سے بستی پر ایسی آفت ٹوٹی کہ گھر کے گھر ختم ہو گئے''

رشتۂ مہر و محبت چھوٹا عشق میں کیسی یہ آفت ٹوٹی (اثر صدیقی)

10. آگ بگولہ ہونا: غصہ ہونا' تمتمانا اٹھنا

''اپنے خلاف روحی کی باتیں سن کر عامر آگ بگولہ ہو گیا''

مجھ پہ ہنستے ہیں تو منہ سرخ ہوا جاتا ہے

خوش ہیں ظاہر میں.....آگ بگولہ دل میں (بحر لکھنوی)

11. آگ میں آگ لگانا: جلے کو جلانا' لڑائی لگانا

''نصیب کو تم نہیں جانتے وہ تو آگ میں آگ لگاتی ہے۔''

داغ پر داغ مرے دل کو دیا کرتے ہیں

آگ میں آگ وہ ہیں اور لگاتے جاتے (صبا لکھنوی)

12. آگ ہونا: جھلا اٹھنا' لال پیلا ہونا

''اپنے اوپر لگائے گئے الزام کو سن کر یا سر آگ ہوا اٹھا''

وہ آگ ہو گیا ہے خدا جانے غیر نے

میری طرف سے اس کے تئیں کیا لگا دیا (میر تقی میر)

13. آنسو پینا: برداشت کرنا

''اسے کبھی خوشی میسر نہ ہوئی اس کی زندگی آنسو پینے میں ہی گزر گئی''

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں

آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں (دیا شنکر نسیم)

14. آنسو خشک ہونا: باوجود کوشش کے رو نہ سکنا

''ریحانہ پر ایسی مصیبت آ پڑی ہے کہ غریب کے آنسو بھی خشک ہو گئے''

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے

دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے (فانی)

15. آنکھ چرانا: کترانا' چشم پوشی کرنا

''وقت پڑنے پر دوست بھی آنکھ چرانے لگتے ہیں۔''

تم نے آنکھیں کیا چرائیں دل کا قصہ کہہ دیا

سب کے سب خاموش ہیں اور داستاں محفل میں ہے (بیخود کلکتوی)

16. آنکھیں ڈبڈبانا: آبدیدہ ہونا' آنکھیں بھرنا

''اُس حادثہ کو دیکھ کر سڑک پر کھڑے لوگوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں''

ڈبڈبائی آنکھ' آنسو تھم رہے کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے (سودا)

17. آنکھ کا کاجل چرانا: چوری کے فن میں یکتا ہونا' عیاری دکھانا

''سلیم کی کیا بات کرتے ہو وہ تو آنکھ کا کاجل چرالے''

یار کی دزدِ نگاہ پر دست بردی ختم ہے

آنکھ کا کاجل چرالے جائے ایسا چور (بحر لکھنوی)

18. آنکھوں سے لگانا: ادب سے لینا' متبرک سمجھنا

''اس نے اپنے والد کے خط کو پہلے آنکھوں سے لگایا' پھر بوسہ دیا۔''

نامہ کو مرے یار نے آنکھوں سے لگایا

مل جائے تو لوں نامۂ تقدیر کے بوسے (شیفتہ)

19. آنکھیں بچھانا: چشم براہ ہونا' کسی کی تعظیم کرنا' بے چینی سے انتظار کرنا

''لوگ فلمی ستاروں کے انتظار میں صبح سے آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔''

وہ اگر آتے ہیں تو آنے دو ہم بھی آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں (سالک)

20. آواز دینا: پکارنا' بلانا

''اس نے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن میں اسے آواز دینا ہی بھول گیا''

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا (صفی لکھنوی)

6.3.2 چند محاورے اور ان کے معنی

اب تک جن محاوروں کا ذکر کیا گیا ان کا نثر اور نظم میں استعمال بھی دیا گیا لیکن ذیل میں کچھ ایسے محاورے دیے جا رہے ہیں جن کا مفہوم بیان کر دیا گیا ہے لیکن استعمال نہیں دیا گیا ہے تا کہ آپ خود اس کے استعمال کے بارے میں سوچ سکیں۔

الٹی گنگا بہنا خلاف دستور بات کرنا

اینٹ سے اینٹ بجانا تباہ کرنا' لڑنا

آب آب ہونا	شرمندہ ہونا' پانی پانی ہونا
آب ودانہ اٹھ جانا	کسی جگہ سے چلنے کا وقت آ جانا
ابرو میں بل آنا	غصہ آنا' تیوری چڑھانا
اپنا الو سیدھا کرنا	دوسرے کو دھوکا دے کر اپنا کام نکالنا
اپنے گریبان میں منہ ڈالنا	اپنے کیے پر شرمانا
انگلی اٹھانا	کسی پر اعتراض کرنا
آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا	حقیقت معلوم ہونا
آواز کسنا	مذاق اڑانا
اوسان خطا ہونا	گھبرا جانا

6.3.3 محاورے ب پ ت ٹ

باغ باغ ہونا: خوش ہونا' پھولے نہ سمانا

''آج اس کا نتیجہ آیا تو سارا گھر باغ باغ ہو گیا۔''

ہم کو ملا کے خاک میں کیا باغ باغ ہے (سحر)

بال بیکا ہونا: نقصان ہونا' آنچ آنا

''میدان جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں کا بال بھی بیکا نہ ہوا''

کبھی اس طرح سے بھی جل اے شمع بال بیکا نہ ہو پروانوں کا (امیر رضا کاظمی)

بخیہ ادھیڑنا: حقیقت کھولنا' راز ظاہر کرنا

''لڑائی میں سیمانے حنا کی بخیہ ادھیڑ دی''

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجہ بجنوں

دے گا تمام عقل کا بخیہ ادھیڑ تو (ذوق)

بات بنانا: بہانہ کرنا

''محمود کو بات بنانے کی عادت ہے۔''

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (غالب)

پاسہ پلٹنا: تدبیر کا بگڑ جانا

''آخری اوور میں میچ کا پاسہ پلٹ گیا''

جس دن فراق یار کا پاسہ پلٹ گیا

ہم جی اٹھیں گے نرد کی صورت مرے ہوئے

پانی پانی ہونا: شرمندہ ہونا' آب آب ہونا

''اپنے بارے میں خالا کی رائے سن کر میں پانی پانی ہوگئی''

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من (اقبال)

پانی پھیر دینا: محنت برباد کر دینا' کام خراب کر دینا

''کلیم کے خلاف مضمون لکھ کر سلیم نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا''

آسماں اپنی عداوت سے نہ پانی پھیر دے

لے چلا ہے خط ہمارا نامہ بر برسات میں (بحر)

پردہ اٹھانا: راز ظاہر کر دینا' بے حجاب ہونا

''سی بی آئی کے چھاپوں نے بہتوں کے اعمال سے پردہ اٹھا دیا''

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج

بے طاقتی نے ہائے وہ پردہ اٹھا دیا (میر)

پیچ و تاب کھانا: بے چین ہونا' بے قرار ہونا

''اختر زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گیا''

نہ کھلے گی عدو کے دل کی گرہ آپ کیوں پیچ و تاب کھاتے ہیں (داغ)

تارے گننا: بے چین رہنا' رات میں نیند نہ آنا

''محبوب کے انتظار میں عاشق رات بھر تارے گنتا رہا''

گنتا ہوں تارے شام سے تا صبح ہجر میں

اک شب نہیں خیال ان آنکھوں کو خواب کا (فتاح)

تکیہ کرنا: بھروسہ کرنا

''بغیر جانے بوجھے کسی پر تکیہ کرنا غلط ہے''

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے (ثاقب لکھنوی)

تہہ و بالا کرنا: الٹ پلٹ دینا' غارت ہونا

''بچوں نے آج سارا گھر تہہ و بالا کر دیا''

دونوں عالم ہوئے تہہ و بالا ہم تھے پردے میں کس قیامت کے

توبہ توڑنا: عہد شکنی کرنا' قول و قسم سے پھر جانا

''کتنے ہی لوگ ہیں جو شراب سے توبہ کرتے ہیں لیکن موقع ملتے ہیں توبہ توڑ دیتے ہیں۔

زاہد کا دل نہ خاطر میخوار توڑیے سو بار توبہ کیجیے سو بار توڑیے

ٹوٹ ٹوٹ کر برسنا: تیز بارش ہونا

''چندی گڑھ میں تین دن سے بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے ہیں''

پہلا ہی دن تھا ترک کیے ہم کو مے کشی

برسا ہی کیا ہے رات کو مینہ ٹوٹ ٹوٹ کر (جلال)

ٹھیس لگنا: صدمہ پہنچنا' دل ٹوٹنا

''گفتگو میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی بات سے دوسرے کو ٹھیس نہ لگے۔''

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو (انیس)

ٹھان لینا: پکا ارادہ کرنا

''اس نے ٹھان لیا ہے کہ وہ اس سال بی۔اے ضرور کر لے گا''

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم (مومن)

6.3.4 چند محاورے اور ان کے معنی

باتوں میں آنا	دھوکے میں آجانا
بغلیں جھانکنا	لاجواب ہونا
بال و پر نکلنا	اختیار سے باہر ہونا
بلیوں اچھلنا	بے حد خوش ہونا
بے پر کی اڑانا	جھوٹے دعوے کرنا
پانی سر سے اونچا ہونا	کسی بات کا انتہا کو پہنچ جانا' معاملہ کا طول پکڑنا

پگڑی اچھالنا	ذلیل کرنا، ہنسی اڑانا
پاپڑ بیلنا	مشکلیں برداشت کرنا
پہاڑ ٹوٹ پڑنا	مصیبت میں پڑنا
تارے توڑنا	مشکل کام انجام دینا
تختہ پلٹنا	تباہ و برباد کر دینا
ٹکٹکی باندھنا	برابر دیکھے جانا
ٹوہ لینا	پتہ لگانا، راز جاننے کی کوشش کرنا
ٹکا سا جواب دینا	صاف انکار کر دینا
ٹھنڈا پڑنا	غصہ اتر جانا

6.3.5 کچھ اور محاورے

محاورں کی دنیا بہت وسیع ہے۔ وہ الفاظ جو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں وہی محاورے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ نے اوپر کے محاوروں میں دیکھا کہ یہ وہی الفاظ اور جملے ہیں جو بات چیت میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن محاورے میں آ جانے کے بعد ان کے معنی اور مفہوم وہ نہیں رہے۔ یہ اپنے لغوی معنی سے بالکل الگ ہو گئے اس طرح یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محاورہ ہمیشہ مجازی اور مرادی معنی دیتا ہے۔

اردو میں محاورے بڑی کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اردو ایک منجھی ہوئی زبان ہے اور جو زبان جتنی منجھی ہوئی ہوگی اس میں اتنا ہی زیادہ محاورے کا استعمال ہوگا۔ ذیل میں مختلف حروف سے شروع ہونے والے چند محاورے دیے جا رہے ہیں۔ انہیں توجہ سے پڑھیے تا کہ ان کا مفہوم یاد رہے۔

جادو جگانا: منتر کرنا، سحر کو عمل میں لانا۔

''اس کی آنکھیں تو جادو جگاتی ہیں''

سرمگیں آنکھیں جو آئینہ میں دیکھیں تو کہا

گھورتے ہیں یہ جگاتے ہوئے جادو مجھ کو (میر تقی میر)

جال بچھانا' دام پھیلانا' مکر وفریب کا ڈھنگ ڈالنا

''اب تو آدمی اگر سمجھداری سے کام نہ لے تو ہر طرف لوگ جال بچھائے ہوئے ہیں۔''

ہاتھ آتی ہے مقدر سے ہمارے دولت

جال کس کس نے بچھایا نہیں دانائی کا (بحر)

جان چرانا: کسی کام سے بچنا' کام نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈنا

''سلیم نے اختر سے کہا یہ کام تو تمہیں کرنا ہی ہے جان چرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

سیکھی ہے ادا تیری مری جان قضا نے

آتے ہی مرے پاس لگی جان چرانے

چپ لگ جانا: گم صم ہو جانا' بت بن جانا

''سلیم پر نہ جانے کیسا حادثہ گزرا ہے کہ اسے چپ لگ گئی''

چپ لگ گئی ہے اے دل شیدا تجھے یہ کیوں

کمبخت کچھ تو کہہ کسی پرسان حال سے (جلال)

چادر تان کر سونا: آرام کی زندگی بسر کرنا

''جب سے اختر دوبئی گیا ہے اس کے گھر والے چادر تان کر سوتے ہیں۔''

دیکھ لیں گے فتنہ محشر کو بھی

اب تو چادر تان کر سوتے ہیں ہم (داغ)

چراغ لے کر گھومنا: بڑی محنت سے تلاش کرنا

''چاہے چراغ لے کر کیوں نہ ڈھونڈو۔ عارف جیسا ایماندار آدمی ملنا ناممکن ہے۔''

مجھ سا مشتاق جمال ایک نہ پاؤ گے کبھی

لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لیکر (ذوق)

حق ادا کرنا: فرض پورا کرنا

''حامد نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح اس نے عارف کی مدد کی۔''

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (غالب)

خاک چھاننا: بہت تلاش کرنا۔ ڈھونڈنا

''آج کل نوجوان ملازمت کے لیے خاک چھانتے پھرتے ہیں۔

کوئے جاناں سے نہ لے جاؤ مری خاک کو

خاک چھانے گی پھر سے بادِ صبا میرے لیے (وحشت)

خبر گرم ہونا: کسی بات کا مشہور ہو جانا

''کچھ دنوں سے یہ خبر گرم ہے کہ امریکہ ایران پر حملہ کرنے والا ہے۔''

ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا (غالب)

دال میں کالا ہونا: شبہ ہونا۔ کچھ گڑبڑ ہونا

''آج میں نے اس کو عقیل کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔

منہ پر بکھرے بال ہیں سب اور ٹوٹا کان میں بالا ہے

ہم نے تو معلوم کیا کچھ دال میں کالا کالا ہے (جرات)

دانتوں میں انگلی دبانا: حیرت۔تعجب۔افسوس ظاہر کرنا

''سرکس میں شیروں کے کھیل کود دیکھ کر تماشائیوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔

رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب

کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب (میر حسن)

دھوم مچانا: ہنگامہ برپا کرنا' شور مچانا

''جہاں نوجوان اکٹھا ہو جائیں وہاں دھوم مچنا ضروری ہے۔''

سی کے لب ایک قیامت سی اٹھادی جائے

رہ کے خاموش ذرا دھوم مچادی جائے (میر)

راہ پر آنا: سیدھے راستے پر آجانا' صحیح ہو جانا

''اسکول جا کر بگڑے بچے بھی راہ پر آجاتے ہیں۔''

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب

کوئی دن اور بھی جیے ہوتے (غالب)

رنگ اڑنا: بے آب ہونا' فق ہونا

''پولیس کو آتا دیکھ کر چور کا رنگ اڑ گیا''

ہے آج کون بام پہ جلوہ نما جو یوں

اڑا ہے رنگ میری طرح آفتاب کا (بسمل)

رنگ رلیاں کرنا: گل چھرے اڑانا۔عیش منانا

''راحت آج کل اپنے دوستوں کے ساتھ دن رات رنگ رلیاں کر رہا ہے۔''

بہار آئی ہے تم کو بلبلو یہ دن مبارک ہو

چمن میں آج کل کر لوگلوں کے ساتھ رنگ رلیاں (ہدایت)

رنگ دکھانا: آفت ڈھانا' غضب ڈھانا

''عراق کی جنگ کے بعد دیکھو امریکہ کیا رنگ دکھاتا ہے۔''

کیا رنگ یہ دکھاتی ہے عالم کو دیکھیے

رہتی ہے اس کے پاؤں سے ہر دم حنا لگی (عارف)

زہرہ آب ہونا: حوصلہ پست ہونا

''ڈاکوؤں سے لڑائی میں سپاہیوں کا زہرہ آب ہو گیا۔''

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے

زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا (غالب)

ستم ڈھانا: غضب کرنا۔ عجیب کام کرنا

ادھر صبا نے یہ گل کھلایا چمن میں کلیوں کو گدگدایا

ادھر ہنسی نے ستم یہ ڈھایا کہ منھ لیا چوم اس حسیں کا (جلیل)

شامت آنا: بُرے دن آنا

''اگر مولوی صاحب اسے سگریٹ پیتے دیکھ لیتے تو اس کی شامت ہی آجاتی۔''

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے (غالبؔ)

صاحب سلامت ہونا: رسمی ملاقات' جان پہچان ہونا

''وسیم کی سارے افسروں سے صاحب سلامت ہے۔''

اور کچھ مطلب نہیں ہاں رہ گئی ہے اتنی بات

راہ میں اس سے کبھی صاحب سلامت ہوگئی (مصحفی)

صلوٰاۃ سنانا: بُرا بھلا کہنا

''سب کے سامنے اپنی بیٹی کو صلواۃ سنانا نفیسہ کی عادت ہے۔''

ہمیں صاحب سلامت کہہ کے صلوٰاتیں سناتے ہیں

غضب کی شوخیاں ہیں ان کی دشنام مؤدب میں (نسیم دہلوی)

صورت نکالنا: تدبیر پیدا کرنا۔ ذریعہ نکالنا

''وائس چانسلر نے آخر کار یونیورسٹی کھولنے کی صورت نکال ہی لی''

تمہارے ظلم کے خوگر ہوئے ہیں نکالو اور صورت امتحاں کی (نساخ)

طوطی بولنا: کسی کا کسی ہنر میں مشہور ہونا' یکتا ہونا

''جب سے اس نے کامیابی حاصل کی ہر طرف اس کا طوطی بول رہا ہے۔''

''ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا

خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا (ذوق)

عرش پر دماغ ہونا: بہت مغرور ہونا

''جب سے وہ الیکشن جیتا ہے اس کا دماغ عرش پر ہے۔''

ان کی نگاہ سے کہیں دشمن گرانہ ہو

کیوں خود بخود دماغ مرا عرش پر ہے آج (نساخ)

عقدہ کشائی کرنا: گرہ کھلنا' مشکل حل ہونا

''آج کے زمانے میں کسی سے عقدہ کشائی کی امید کرنا غلط ہے۔''

پنجۂ شاہ کو دیا ہے فلک کب ناخن

جانتا ہے کہ یہ ہے عقدہ کشائی کرنا (ذوق)

عید کا چاند ہونا: بہت کم ملنا' مدتوں دکھائی نہ دینا

''پیلی بھیت جانے کے بعد زہرا عید کا چاند ہوگئی ہے۔''

کب سے شبِ فراق ہوں مشتاق دید کا

خورشید ہوگیا ہے مجھے چاند عید کا (داغ)

غضب ڈھانا: فتنہ برپا کرنا

''آج کل نفرت کی سیاست ہر جگہ غضب ڈھا رہی ہے۔''

ستم توڑے گی چشم اس عشوہ گر کی

غضب ڈھائے گی شوخی اس نظر کی (سید احمد)

فریب کھانا: دھوکہ کھانا' جال میں پھنسنا

''حامد نے تجارت کے سلسلے میں بہت فریب کھائے۔''

فریب کھائے ہیں رنگ و بو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں

مگر نتائج کی روشنی میں' میں اپنی منزل پہ آ رہا ہوں (جمیل مظہری)

قصہ پاک کرنا: جھگڑا طے کرنا' بات کو ختم کرنا

''جائداد کا بٹوارہ کر کے ساجد نے روز روز کے جھگڑے کا قصہ پاک کر دیا۔''

لگا کر تیغ قصہ پاک کیجیے دادخواہوں کا کسی کا فیصلہ گر منصفی سے ہو نہیں سکتا

کان بھرنا: لگائی بجھائی کرنا

''شکیل کی یہ بری عادت ہے کہ وہ رحمت کے خلاف لوگوں کے کان بھرتا رہتا ہے۔''

دیکھ کر کیوں وہ مجھے آنکھ چرا جاتا ہے　　مدعی نے نہیں اس گل کے اگر کان بھرے

کان میں تیل ڈالنا: چپ سادھنا' خاموشی اختیار کرنا

''شاکر نے اسے سے ملازمت کے لیے کئی بار کہا لیکن وہ تو لگتا ہے کان میں تیل ڈال کر بیٹھا ہے''

سوز پروانہ یوں سنے ہے چراغ　　کان میں جیسے تیل ڈالا ہے

گل کھلانا: نئی بات ہونا' عجیب بات ہونا

''شیلا نے اسکول میں ایسے گل کھلائے کہ سب حیران رہ گئے''

دیکھا تو گل ہوا ہوا ہے　　کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. محاورہ کسے کہتے ہیں؟
2. پاسہ پلٹنے کے کیا معنی ہیں؟
3. تکیہ کرنا سے کیا مراد ہے؟

6.4 ضرب المثل یا کہاوت

ضرب المثل لفظوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو عبارت کے لحاظ سے مکمل ہو اور اسے اپنے مفہوم کے لیے کسی دوسری عبارت کی ضرورت نہ پڑے۔

ضرب المثل دراصل وہ جملے ہیں جو کثرت استعمال سے کہاوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ ضرب المثل میں کسی طرح کی تبدیلی یا اس کے الفاظ میں الٹ پھیر کی اجازت نہیں ہے جب کہ ہم نے پچھلے اوراق میں محاورے کے سلسلے میں یہ دیکھا ہے کہ اس میں لفظوں کے الٹ پھیر کی ممانعت نہیں ہے۔ ضرب المثل زبان کی خوبصورتی اور اس کی گہرائی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ذیل میں چند کہاوتوں کو ان کے استعمال کے ساتھ دیا جارہا ہے تا کہ ان کے معنی کو سمجھنے میں آپ کو کوئی دشواری نہ ہو۔

آدھا تیترا آدھا بٹیر: کچھ ایک طرح کا کچھ دوسری طرح کا

''یہ کیسی دیوار چنی ہے کہیں پکی اینٹ ہے کہیں کچی دیوار کیا ہے آدھا تیتر آدھا بٹیر''

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا: ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں گرفتار ہونا

''مرکزی سرکاری نے سیاسی لیڈر کو رہا کر دیا تھا۔اب ریاست نے گرفتار کرلیا۔آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔''

آم کے آم گھٹلیوں کے دام: دوہرا فائدہ

''تربوز ہندوستان کا کیا عمدہ پھل ہے'لوگ گودا کھاتے ہیں' چھلکوں کی ترکاری بناتے ہیں۔آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔''

اشرفیاں لٹیں کوئلوں پر مہر: ضروری خرچ میں کنجوسی اور فضل کاموں پر بہت زیادہ خرچ

''گھر میں ارہر کی دال گھٹتی ہے اور شہر کا سفر ٹیکسی میں ہوتا ہے۔اشرفیاں لٹیں کوئلوں پر مہر۔''

اونٹ کے منہ میں زیرا: ضرورت سے بہت کم

''دہلی سے گھنٹہ والے کا حلوا اتنا سا لے کر چلے تھے'اونٹ کے منہ میں زیرا۔''

ایک پنتھ دو کاج: ایک معاملہ میں دو کام نکل آنا

''حبیب تنویر کے ساتھ ڈراما آگرہ بازار کرنے کشمیر چلے جایئے رقم بھی بنے گی اور سیر بھی ہو جائے گی۔ایک پنتھ دو کاج''

اونچی دکان پھیکا پکوان: صرف نام ہی نام

''کئی برس بعد سندیلے کے لڈو کھائے۔مگر اب وہ مزہ کہاں۔اونچی دکان' پھیکا پکوان''

اندھیرے گھر کا اجالا: اکلوتا، بیٹا، بیٹی

''مسز اندرا گاندھی نہرو خاندان میں اندھیرے گھر کا اجالا تھیں۔''

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا: اتفاقاً کوئی موقع مل گیا۔

''ایک صاحب قبل از وقت ریٹائر کر دیے گئے اس لیے ہمیں ترقی کا موقع مل گیا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا''

بھینس کے آگے بین بجانا: بے وقوف کے سامنے عقل کی باتیں کرنا

''رجعت پرستوں کے سامنے سوشلزم کی بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔''

پتھر کو جونک نہیں لگتی: بے حیا پر کچھ اثر نہیں ہوتا

''میاں! اس کی بداطواری پر اسے دنیا سمجھا چکی مگر پتھر کو جونک نہیں لگتی''

تھوتھا چنا باجے گھنا: کم ظرف بڑے دعوے کرتے ہیں۔

''فرقہ پرست لوگ مرکزی سرکار پر قبضہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اس کا کیا غم ہے تھوتھا چنا باجے گھنا

ٹیڑھی کھیر: مشکل کام، پیچیدہ معاملہ

''ملک میں تمام سیاسی جماعتوں کا متحد ہونا ٹیڑھی کھیر ہے۔''

جس کی لاٹھی اس کی بھینس: زبردست ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

''جنرل سوہرٹو نے انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا جس کی لاٹھی اس کی بھینس''

چمڑی جائے دمڑی نہ جائے: کنجوس جانی نقصان اٹھاتا ہے لیکن پیسہ خرچ نہیں کرتا۔

''بیماری میں اس نے اپنا علاج نہیں کرایا اور مرض بڑھتا جا رہا ہے وہی مثل ہے چمڑی جائے دمڑی نہ جائے''

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے: صحبت کا اثر بہت ہوتا ہے۔

''اس کالونی میں آ کر ہمارے بچے بھی فیشن سے رہنا سیکھ گئے ہیں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ

رنگ پکڑتا ہے۔''

دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر: پڑوسی سے دشمنی اچھی نہیں

''بھئی! تم نے اس کالونی میں اپنے پڑوسی سے تعلقات کیوں خراب کر رکھے ہیں دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر''

دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا: دونوں طرف سے محروم رہنا

''بیوی کی ترغیب پر ماں باپ سے بگاڑ لی' اور سسرال میں بھی گزارا نہ ہوا۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔''

شہر میں اونٹ بدنام: ہر کام میں مشہور آدمی کی ہی شامت آتی ہے۔

''دہلی میں کسی قسم کا بھی چندہ ہو لوگ ''ہمدرد دواخانہ پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی شہر میں اونٹ بدنام

طویلے کی بلا بندر کے سر: خطا کوئی کرے سزا کوئی بھگتے۔ بہت سے لوگوں کی بلا ایک غریب پر پڑنا۔

''کلاس کے تمام لڑکے شور مچا رہے تھے اور سزا مانیٹر کو ملی۔ طویلے کی بلا بندر کے سر''

کھسیانی بلی کھمبا نوچے: شرمندہ ہو کر ٹال مٹول کرنا۔ ہار کے بعد کی ناراضگی

''مخالف سیاسی پارٹیاں مرکزی حکومت کا کچھ بگاڑ نہیں کر سکیں۔ اب زبانی بکواس کرتی ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔''

کھچڑی کھاتے پہنچا اترتا: جھوٹی نزاکت ظاہر کرنا۔ ذرا سے کام سے تکلیف محسوس کرنا۔

''آج کل اس کے مزاج کو نہ پوچھیے کھچڑی کھاتے پہنچا اترتا ہے۔

گڑ کھائے گلگلوں سے پرہیز: بڑی برائیاں کرنا اور چھوٹی برائیوں سے بچنا

''امتحان کی کامیابی میں نمبر بڑھا دیتے ہیں مگر داخلے کے وقت طالب عالم سے رعایت خلافِ اصول ہے۔ گڑ کھائے گلگلوں سے پرہیز۔''

نام بڑا درشن چھوٹے: کسی کا نام کسی کام میں بہت مشہور ہو۔ اور تجربہ کے بعد غلط ہو۔

''بڑی شخصیتوں کو قریب سے دیکھیے تو بعض کے متعلق یہی کہنا پڑے گا۔ نام بڑا درشن چھوٹے

نیکی برباد گناہ لازم: بھلائی کرنے پر بُرائی ملنا

''مشرق میں اخلاق کا بڑا چرچا ہے مگر عالم یہ ہے کہ آپ جس کی بھلائی کے لیے بات بتائیں گے وہ اس کو عیب جوئی قرار دے گا اور خفا ہو جائے گا۔ یعنی نیکی برباد گناہ لازم۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا: جو بات ظاہر ہو اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت

''اخبار آپ کے سامنے ہے اپنی فرسٹ ڈویژن ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔''

ہاتھی نکل گیا۔ دم رہ گئی: معمولی کام باقی رہ جانا

''آپ کی کتاب کس منزل میں ہے؟ جلد ساز کے یہاں ہے۔ ہاتھی نکل گیا دم رہ گئی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات: اچھی چیز ابتدا ہی سے معلوم ہو جاتی ہے۔

''سرسید اور راجہ رام موہن رائے کے بچپن کے حالات پڑھ کر اس سچائی کو ماننا پڑتا ہے۔'' ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات''

یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی: یہ کام پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

''کیا اردو کالجوں میں ذریعۂ تعلیم بنا دی جائے گی؟ بھئی! یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہیں آتی۔''

یہ منہ اور مسور کی دال: اس منصب اور کام کے لائق نہیں۔

''اس نے یونیورسٹی سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے۔ کیا اسے سفیر یا گورنر بنا دیا جائے گا میاں! توبہ کرو یہ منہ اور مسور کی دال''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. ضرب المثل کیا ہے؟

5. جس کی لاٹھی اس کی بھینس سے کیا مراد ہے؟

6.5 خلاصہ

اس اکائی میں اردو محاورے اور ضرب المثل یا کہاوتوں کے معنی، مفاہیم اور محل استعمال کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کسی بھی زبان میں محاوروں اور کہاوتوں کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے یہ بات سمجھی کہ جن الفاظ کو ہم ہر وقت استعمال کرتے ہیں ان کے صرف وہی معنی نہیں ہوتے جن میں ہم ان کو بولتے ہیں۔ ان کے کئی اور معنی بھی ہوتے ہیں جو اس کے استعمال سے بدل جاتے ہیں۔ کبھی اس کے اصطلاحی معنی لیے جاتے ہیں اور کبھی اسے مجازی یا مرادی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے محاوروں میں آپ نے دیکھا کہ اس کے لغوی کے بجائے مجازی معنی لیے جاتے ہیں۔ اس لیے ضرب المثل کا زبان میں الگ ہی مرتبہ ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے اس بات میں زور اور اثر پیدا ہوتا ہے۔ جو بات کہی جارہی ہے۔

اس طرح اس اکائی کو آپ غور سے پڑھیں زبان کے صحیح اور بامحاورہ استعمال میں اس سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔

6.6 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 کہاوت کسے کہتے ہیں؟ کوئی تین کہاوتیں لکھیے۔

2 محاورہ کسے کہتے ہیں؟ کوئی پانچ محاورے اور ان کے معنی لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 کوئی پانچ محاوروں کے معنی سمجھائیے، اور ان کے استعمال کی شعری مثالیں دیجیے اور خود جملے میں استعمال کیجیے۔

2. زبان میں محاورے اور ضرب المثل کی کیا اہمیت ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

6.7 فرہنگ

مصدر وہ کلمہ جس سے افعال وصفات بیان ہوتے ہیں جیسے کھانا۔ آنا وغیرہ

تکیہ کرنا	بھروسا کرنا	مفہوم	معنی، مطلب
کثرت	زیادتی کے ساتھ	لغوی معنی	جولغت میں دیے ہوں، اصل معنی
دانائی	عقل مندی، ہوشیاری	مشتاق	شوق رکھنے والا

6.8 معاون کتابیں

نوٹ: اس اکائی میں زیادہ تر محاورے اور ضرب المثل درج ذیل کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ محاورے اور ضرب المثل کے تفصیلی مطالعے کے لیے آپ ان کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

1. ڈاکٹر سیفی پریمی ہمارے محاورے
2. ڈاکٹر فخر الدین صدیقی اثر اردو محاورے

6.9 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. دو یا دو سے زائد الفاظ کا وہ مجموعہ جو اصل معنی کے بجائے مجازی معنی میں بولا جائے۔
2. تدبیر کا بگڑنا
3. بھروسہ کرنا
4. ضرب المثل وہ جملہ ہے جو کثرتِ استعمال سے کہاوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے؟
5. زبردست یا طاقت ور ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

اکائی 7: اردو کی شعری اصطلاحات

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 تشبیہ اور اُس کے اجزا

7.3.1 مشبہ 7.3.2 مشبہ بہ

7.3.3 وجہ تشبیہ 7.3.4 حرف تشبیہ

7.4 استعارہ

7.4.1 استعارہ بالتصریح 7.4.2 استعارہ بالکنایہ

7.5 مجاز مرسل

7.6 کنایہ

7.6.1 کنایہ اور استعارہ کا فرق 7.6.2 کنایہ کی قسمیں

7.7 صنائع معنوی

7.7.1 صنعت تلمیح 7.7.2 مبالغہ

7.7.3 غلو

7.8 اجزائے شاعری

7.8.1 مطلع 7.8.2 مقطع

7.8.3 قافیہ 7.8.4 ردیف

7.9 خلاصہ

7.10 نمونہ امتحانی سوالات 7.11 فرہنگ
7.12 معاون کتابیں 7.13 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد اردو کی شعری اصطلاحات کے مفہوم کی وضاحت ہے۔ شاعری میں اکثر ایسی باتیں، مثالیں اور اشارے آجاتے ہیں جو پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے یا سامنے کے الفاظ سے ان کا جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اس سے وہ مراد نہیں ہوتا یا اس کے علاوہ بھی اس کے مطالب ہوتے ہیں۔ اس لیے جب تک ان شعری اصطلاحات کو نہ سمجھا جائے۔ شعر کا پورا لطف نہیں آتا۔ اس اکائی میں اسی بات کی کوشش کی گئی ہے کہ شعر میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کو آپ سمجھ سکیں اور شعر کے محاسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔

7.2 تمہید

آپ کو معلوم ہے کہ جب ہم کسی اپنے سے بڑے عہدے والے یا کسی بزرگ سے باتیں کرتے ہیں تو اچھی سے اچھی زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور گفتگو کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اس کو متاثر کر سکیں۔ بالکل یہی شاعری کی بات ہے۔ شاعر اپنے خیالات یا جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اس کا مخاطب اس کا محبوب ہوتا ہے۔ کبھی اس کا مخاطب خدا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی اور شخص۔ ان میں ہر ایک تک اپنی بات پہنچانے کے لیے وہ عمدہ سے عمدہ زبان استعمال کرتا ہے۔ وہ سادہ اور سیدھے سادے الفاظ میں بھی بات کرتا ہے۔ لیکن عام طور پر ان سادہ الفاظ میں ایسی باریکیاں، نکتے اور اشارے چھپے ہوتے ہیں جو اس شعر کو بہت خوبصورت اور دل پر اثر کرنے والا بنا دیتے ہیں۔ ان نکتوں اور اشاروں کو عام زبان میں شعری اصطلاحات کہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک وسیع علم ہے۔ جسے علم بیان اور علم بدیع کہتے ہیں۔

علم بیان یہ سکھاتا ہے کہ کسی بات کو نئے سے نئے انداز میں کس طرح پیش کیا جائے اور الفاظ کا وہ کون سا طریقۂ استعمال ہے جس سے ایک ہی لفظ کے ایک معنی سے دوسرے معنی زیادہ دلکش اور خوبصورت ہوں اور ہم ان پر

جتنا غور کرتے جائیں معنی کی نئی نئی جہتیں ہمارے سامنے آتی جائیں جس کا دعویٰ میر انیس نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں میر انیس

علم بیان کی چار قسمیں ہیں:

1- تشبیہ 2- استعارہ 3- مجاز مرسل 4- کنایہ

اس اکائی میں علم بیان کی قسموں اور شعری اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ آپ اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔

7.3 تشبیہ اور اُس کے اجزاء

علم بیان کے اجزاء میں یوں تو سب ہی اہم ہیں اور ان سے گفتگو یا شاعری میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن تشبیہ کو ان میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بیان کا یہ ایک ایسا جزو ہے جس کا استعمال چھوٹا بڑا ہر شخص کرتا ہے چاہے وہ جانتا ہو یا نہیں کہ وہ تشبیہ کا استعمال کر رہا ہے لیکن یہ اس کی گفتگو میں شامل ہوتی ہے۔ آپ نے لوگوں کی بات چیت میں اس طرح کے جملے ضرور سنے ہوں گے۔

1. یہ آم تو شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔
2. اس بچے کا چہرہ چاند کی طرح ہے۔
3. وہ لڑکی پھول جیسی نازک ہے۔
4. اس کا حسن پریوں جیسا ہے۔

ان جملوں میں بالکل انجانے میں کچھ مثالیں آ گئی ہیں۔ شہد سے زیادہ میٹھا' چاند کی طرح چہرہ' پھول جیسی نازک' پریوں جیسا حسن' اسی طرح کسی چیز سے مشابہت ظاہر کرنے کے لیے جو مثال دی جاتی ہے۔ اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں۔

تشبیہ: جب کسی چیز کی اچھائی یا برائی ظاہر کرنے کے لیے کسی دوسری چیز سے مثال دی جائے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔تشبیہ کے معنی باہمی مشابہت کے ہیں۔مثلاً

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (میر تقی میر)

اس شعر میں شاعر نے محبوب کے لبوں کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔تشبیہ میں جس چیز کو جس چیز سے تشبیہ دی جائے اس میں مشابہت کا ہونا ضروری ہے۔مثلاً ان اشعار کو دیکھیے۔

مینہہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے

اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی میر

☆☆☆

سرتاقدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم

پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں درد

پہلے شعر میں مینہہ کی بوچھار سے اشک فشانی کو تشبیہ دی گئی ہے۔یعنی مینہہ کی بوندوں اور آنسوؤں میں جو مشابہت ہے اس کی بنا پر شاعر نے اشک افشانی سے مینہہ کی بوچھار کو تشبیہ دی ہے۔اسی طرح دوسرے شعر میں اپنی بے زبانی کو شمع سے تشبیہ دی۔شمع کی لو زبان کی طرح ہوتی ہے لیکن سرتاپا زبان ہونے کے باوجود وہ گفتگو نہیں کرتی۔ اسی طرح میں ہوں کہ سرتاپا' خواہش گفتگو ہوں لیکن گفتگو نہیں کرسکتا۔ یہاں پر اپنی خاموشی اور شمع کی خاموشی میں مشابہت پیدا کی ہے۔اسی خاموشی کے مضمون کو میر نے ایک اور شعر میں نظم کیا ہے اور بڑی خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ آپ نے یہ شعر ضرور پڑھا ہوگا۔

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے

جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ میر

اب اس شعر میں مشابہت دیکھیے محفل میں جب کسی کو جگہ نہیں ملتی تو وہ دیوار کے سائے میں لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے تا کہ محفل کو دیکھ سکے۔ میر اس کی مثال اس تصویر سے دیتے ہیں جو دیوار سے ٹنگی رہتی ہے۔ وہ تصویر بھی محفل میں ہونے کے باوجود محفل کی خاموش تماشائی ہوتی ہے اسی طرح اس شعر میں شاعر محبوب کی محفل میں اس طرح دیوار سے لگ کر خاموش کھڑا ہے جیسے کسی نے تصویر لگا دی ہو۔ میر کو تشبیہات پر بڑی قدرت ہے وہ نئی سے نئی تشبیہ وضع کرتے ہیں اور ان کی تشبیہیں دل میں اتر جاتی ہیں۔ ماہرین علم بیان نے تشبیہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) مشبہ (2) مشبہ بہ (3) وجہ تشبیہ (4) حروف تشبیہ۔ یوں بنیادی طور پر تشبیہ میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے ایک کو مشبہ کہتے ہیں۔

7.3.1 مشبہ

جس کو کسی چیز سے تشبیہ دی جائے۔ یعنی بنیادی طور پر کوئی چیز ہوگی جس کو تشبیہ دیں گے اس شخص یا چیز کو مشبہ کہتے ہیں۔ جیسے عذرا کی آنکھیں ہرن جیسی ہیں۔ یہاں پر عذرا مشبہ ہے جس کی آنکھوں کی خوبصورتی کو ہرن کی آنکھوں سے تشبیہ دی گئی۔ میر کا ایک شعر ہے:

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

اس میں گل رخ (محبوب) مشبہ ہے۔

7.3.2 مشبہ بہ

تشبیہ کے لیے جن دو ضروری چیزوں کا ذکر کیا گیا اس میں دوسری چیز مشبہ بہ ہے۔ یعنی جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔ مشبہ بہ وہ چیز ہے جس سے کسی شخص یا چیز کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً عذرا کی آنکھیں ہرن کی طرح ہیں، یہاں پر عذرا کی آنکھوں کو ہرن سے تشبیہ دی گئی۔ لہذا ہرن مشبہ بہ ہے۔

میر کے شعر میں مشبہ بہ کی مثال دیکھیے۔

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے

جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

اس میں 'ہم' مشبہ ہے اور تصویر جس سے تشبیہ دی گئی مشبہ بہ ہے۔

7.3.3 وجہ تشبیہ

اوپر تشبیہ کے چار حصوں کا ذکر آیا تھا جس میں دو حصے مشبہ اور مشبہ کے بارے میں آپ کو بتایا جا چکا ہے۔ اس کا تیسرا حصہ وجہ تشبیہ کہلاتا ہے۔

وجہ تشبیہ اس خوبی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اسے کسی چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں نازکی وجہ تشبیہ ہے یعنی شاعر نے لبوں کی نزاکت کی وجہ سے انہیں گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ اس طرح اس شعر میں نزاکت وجہ تشبیہ ہے۔

7.3.4 حرف تشبیہ

تشبیہ کا چوتھا حصہ حرف تشبیہ ہے جو تشبیہ کو ظاہر کرتا ہے۔

حرف تشبیہ وہ لفظ ہے جو تشبیہ کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آئے یا جس سے یہ معلوم ہو کہ تشبیہ دی گئی ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو ہماری زبان اور خاص طور پر شاعری میں حرفِ تشبیہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً جیسا، جیسی، جیسے، گویا، مانند، مثل، کی صورت، جوں وغیرہ۔ میر کے شعر میں اب ان چاروں حصوں کو دیکھیے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں لب : مشبہ

پنکھڑی اک گلاب : مشبہ بہ

نازکی : وجہ تشبیہ

کی سی : حرف تشبیہ

اس طرح ہمارے شعرا نے تشبیہ میں ندرت اور نیا پن پیدا کرنے کے لیے مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ تشبیہ میں اپنی جدت طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. تشبیہ کی تعریف کیجیے۔
2. وجہ تشبیہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

7.4 استعارہ

استعارہ کے معنی مستعار لینے کے ہیں۔ کوئی لفظ جس کے اصلی یا لغوی معنی نہ لیے جائیں بلکہ اس کو نئے معنی میں استعمال کیا جائے یعنی اس سے نئے معنی مستعار لیے جائیں، اسے استعارہ کہتے ہیں۔

استعارے کو انگریزی میں Metaphor اور ہندی میں النکار کہتے ہیں۔ استعارے سے زبان میں وسعت، دلکشی اور معنی میں تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ شعرا نے استعارے کے ذریعے کلام میں معنی آفرینی پیدا کی ہے۔ چونکہ استعارہ لغوی معنوں میں محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ جملے یا شعر میں استعمال ہونے والے دوسرے الفاظ کے سیاق میں معنی دیتا ہے۔ اس لیے استعارہ تشریح میں وسعت پیدا کرتا ہے اور اس کے نئے نئے گوشے پیدا کرتا ہے۔

تشبیہ اور استعارہ علم بیان کی دو قسمیں ہیں لیکن دونوں میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ تشبیہ میں مشبہ کی مثال کسی چیز جسے مشبہ بہ کہتے ہیں، سے دی جاتی ہے۔ اس کو اس جیسا یا اس کے مانند قرار دیا جاتا ہے جیسے سلیم شیر کی طرح طاقت ور ہے۔ اس میں سلیم کی طاقت کی مثال شیر سے دی گئی اس لیے اسے تشبیہ کہتے ہیں لیکن استعارہ میں مشبہ بہ کو مشبہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جیسے سلیم شیر ہے، میں شیر سلیم کی طاقت کا استعارہ ہے۔ اب اس معنی کے بہت سے پہلو پیدا

ہو سکتے ہیں وہ بہادر ہے۔ وہ نڈر ہے، وہ بے حد مضبوط ہے۔ وہ اپنے حلقہ کا سب سے زیادہ اہم فرد ہے وغیرہ وغیرہ اس طرح تشبیہ کے محدود معنی استعارے میں معنی کی ایک وسیع دنیا بن جاتے ہیں۔ اس کا ذکر آ چکا ہے کہ تشبیہ میں لغوی معنی ہی آخری معنی ہوتے ہیں۔ حرف تشبیہ اس کے معنی کو صرف تشبیہ کے دائرے میں محدود کر دیتا ہے۔ لیکن استعارے میں ایسا نہیں ہے۔ استعارے کے معنی لغت سے تعلق نہیں رکھتے اس لیے لسانی سیاق میں ان کے معنی تبدیل ہوتے رہتے ہیں جس کی مثال اوپر سلیم اور شیر کے استعارے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ استعارے کی کئی قسمیں ہیں۔

7.4.1 استعارہ بالتصریح

یہاں پر استعارے کی قسموں سے پہلے ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ تشبیہ میں جس چیز کو مشبہ کہتے ہیں۔ اسے استعارے میں مستعار لہ کہتے ہیں۔ یہاں پر صرف اصطلاح تبدیل ہوگئی ہے۔ تشبیہ میں مشبہ اسے کہتے ہیں جس کے لیے تشبیہ کا استعمال ہو اور استعارے میں مستعار لہ اسے کہتے ہیں جس کے لیے استعارے کا استعمال کیا جائے اس طرح جسے تشبیہ میں مشبہ بہ کہتے ہیں وہ استعارے میں مستعار منہ کہلاتا ہے۔

استعارے کی یوں تو کئی قسمیں ہیں لیکن ان میں دو قسموں کا ذکر زیادہ آتا ہے۔ اس کی پہلی قسم استعارہ بالتصریح ہے۔

استعارہ بالتصریح: جس میں مشبہ یعنی مستعار لہ کا بیان نہ ہو بلکہ صرف مشبہ بہ یعنی مستعار منہ ظاہر ہو اور اس کی تصریح موجود ہو۔ مثلاً امیر مینائی کا یہ شعر دیکھیے۔

میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اٹھ گیا امیر
بلبل چہک کے صحنِ چمن سے نکل گیا

اصغر گونڈوی

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

پہلے شعر میں بلبل چہک کے صحن چمن سے نکل گیا یا الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے یا میر انیس کا شعر:

شعلے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا تھا ریاض ..... میں

ان مثالوں میں استعارہ بالتصریح سے کام لیا گیا ہے۔

7.4.2 استعارہ بالکنایہ

استعارے کی دوسری قسم 'استعارہ بالکنایہ' ہے۔

استعارہ بالکنایہ: میں مشبہ بہ یعنی مستعار منہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لوازمات بیان کر کے کنایہ میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور مشبہ یعنی مستعار لہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً

سازیہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں داغ

یا میر کے اس شعر میں استعارہ بالکنایہ کا استعمال دیکھیے۔

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم
حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

اس شعر میں موئے دلبر کو مشک کہہ کر مشبہ بہ کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ اس طرح شاد کا یہ شعر دیکھیے۔

خوشبو سے جن گلوں کی مہکتے تھے دو جہاں
کیوں اے صبا وہ پھول چمن سے کدھر گئے شاد عظیم آبادی

استعارے کی ان مثالوں پر اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ استعارے نے شعر کی معنوی اور فکری سطح کو بہت بلند کر دیا ہے۔ ان میں صراحت بھی ہے اور کنایہ بھی۔ یوں تو استعارہ ایک وسیع علم ہے اور اس کے بہت سے پہلو ہیں جو رفتہ رفتہ اشعار کے مطالعے سے ظاہر ہوتے جائیں گے۔ یہاں پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ استعارہ علم بیان کا وہ جز ہے جو شعر کو دلکش، پر اثر اور کثیر المعنی بناتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

3. استعارہ کسے کہتے ہیں؟

4. استعارہ بالکنایہ کی مثال میں ایک شعر پیش کیجیے۔

7.5 مجاز مرسل

زبان کے استعمال کا ایک دلکش اور دلچسپ پہلو مجاز مرسل ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ لغت میں ہر لفظ کے طے شدہ معنی ہیں۔ ہم ان الفاظ کو انہیں معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مجاز مرسل میں ان معنی کے علاوہ لفظ کو دوسرے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے حقیقی اور مجازی معنی میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مجاز مرسل' میں لفظ کو اس کے لغوی یا حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں تشبیہ کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ مجاز مرسل کی بہت سی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ اردو شعرا نے لفظ کے استعمال میں طرح طرح کے گوشے پیدا کئے ہیں اور مجاز مرسل کے ذریعہ شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

جب ہاتھ اس کی نبض پہ رکھا طبیب نے
محسوس یہ ہوا کہ بدن میں لگی ہے آگ

یہاں پر شاعر نے ہاتھ کا ذکر کر کے انگلیاں مراد لیں ہیں اس لیے یہاں ہاتھ کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ انگلیاں ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حکیم یا ڈاکٹر جب مریض کو دیکھتے ہیں تو اس کی نبض پر انگلیاں رکھ کر اس کے بخار یا اندرونی کیفیت کا اندازہ کرتے ہیں لیکن یہاں شاعر نے کل (ہاتھ) کہہ کر جزو (انگلیاں) مراد لیا ہے۔

مجاز مرسل کا استعمال آپ روزمرہ کی اپنی گفتگو میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں پر صرف ایک مثال دوں گا تا کہ آپ کو اپنی بات چیت میں اس کا اندازہ ہو کہ آپ کب اور کہاں مجاز مرسل کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ ظرف کہہ کر اس کے اندر کی چیز (مظروف) مراد لیتے ہیں جیسے آپ سے کسی نے دریافت کیا۔

آپ چائے پئیں گے

اور آپ جواب دیتے ہیں۔ صبح سے کئی پیالی پی چکا

حالانکہ آپ نے کئی پیالی چائے پی۔ پیالی نہیں پی اس لیے کہ پیالی تو ظرف ہے جس میں چائے بھر کر کسی کو دی جاتی ہے۔ اس طرح آپ نے ظرف کہہ کر مظروف کو مراد لیا یعنی آپ نے اپنی گفتگو میں مجاز مرسل سے کام لیا۔ اسی طرح کبھی مظروف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے مراد ظرف ہوتا ہے۔ مثلاً آپ اپنے کسی دوست سے کہیں کہ

شربت میز پر رکھا ہے لے لو

اب آپ خود سوچیے کہ شربت میز پر نہیں رکھا جا سکتا۔ شربت گلاس میں ہوگا اور گلاس میز پر رکھا ہوگا۔ لیکن آپ نے مجاز مرسل کا استعمال کیا اور شربت یعنی مظروف کہہ کر گلاس (ظرف) مراد لیا۔ فقیر دہلوی کا ایک شعر دیکھیے۔ کس طرح انہوں نے مجاز مرسل سے شعر میں ایک نیا لطف پیدا کیا ہے۔

روتے روتے جو مرے دیدۂ تر بیٹھ گئے

ایسی برسات ہوئی آہ کہ گھر بیٹھ گئے

کسی چیز کا بیٹھ جانا اس کے گر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً دیوار بیٹھ گئی۔ چھت بیٹھ گئی وغیرہ لیکن یہاں پر بیٹھ گئے اپنے لغوی معنی میں نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ اندھے ہو جانے، آنکھیں ختم ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

5. مجاز مرسل سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

6. دیدۂ تر کے بیٹھنے سے کیا مراد ہے؟

7.6 کنایہ

کنایے کے معنی پوشیدہ یعنی چھپے ہوئے اشارے یا بات کے ہیں۔ کنایہ میں کسی بات کو تفصیل سے کہنے کے بجائے اشارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ کنایہ کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ لغوی معنوں کے بجائے علحدہ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں لیکن اس کی گنجائش رہتی ہے کہ اس سے لغوی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ کنایہ، جس کی

تعریف مقصود ہو اس کی ذات یا صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

7.6.1 کنایہ اور استعارہ کا فرق

اس سے پہلے استعارے کے بارے میں اس کا ذکر آ چکا ہے کہ استعارہ غیر حقیقی معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ کنایہ اور استعارے میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں حقیقی یا لغوی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں لیکن اگر کسی جگہ حقیقی معنی نہیں مراد لیے جا سکتے تو وہ استعارہ کہلائے گا کنایہ نہیں۔

7.6.2 کنایہ کی قسمیں

کنایہ کی کئی قسمیں ہیں جس میں دو قسمیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ (1) کنایہ قریب (2) کنایۂ بعید

(1) کنایۂ قریب: کنایہ قریب اسے کہتے ہیں جس میں کسی شخص یا چیز کی صفت کا بیان کیا جائے اور اس سے وہ شخص یا چیز مراد لی جائے اور ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ تو اسے کنایہ قریب کہتے ہیں۔ جیسے 'سن سفید' کہنے سے ذہن فوراً ایسے بوڑھے آدمی کی طرف جاتا ہے جس کے سارے بال سفید ہو چکے ہوں۔

(2) کنایہ بعید: جب کسی شخص کے ساتھ کئی صفتیں وابستہ ہوں۔ خواہ وہ صفتیں دوسری چیزوں میں بھی پائی جاتی ہوں لیکن ان سے مراد وہی شخص یا چیز ہو تو اسے کنایہ بعید کہیں گے۔ مثلاً میر انیس کا ایک بند دیکھیے جس میں کنایہ قریب اور کنایہ بعید دونوں کی مثالیں یکجا ہو گئی ہیں۔

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاض نبی کے پھول　　خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول

دنیا کی زیب ' زینت کا شانہ ' بتول　　وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسول

ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں لٹ گیا

وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

میر انیس

اب ذرا توجہ سے اس بند پر غور کیجیے۔ پہلے مصرعے میں دو کنایے' کانٹوں اور 'ریاض نبی' استعمال ہوئے

ہیں۔کانٹے تکلیف دہ ہوتے ہیں اس لیے اس مصرعے میں وہ کنایہ ہیں دشمنان آل محمد ﷺ کا اس سے مراد ظالم، سخت دل اور دشمن کے ہیں۔

دوسرا کنایہ ریاض نبی ہے یعنی نبی کا باغ، مراد رسول خدا محمد مصطفیٰ ﷺ کے اہل بیت ہیں۔یہ دونوں کنایے کنایہ بعید کی تعریف میں آتے ہیں۔

تیسرے مصرعے میں بتول کنایہ ہے جناب فاطمہؑ سے جو کنایہ قریب ہے۔

چوتھے اور چھٹے مصرعے میں، وہ باغ، یعنی باغ رسول یعنی آل نبی ﷺ اور باغیوں، یعنی دشمنوں، ظالموں، کنایۂ قریب ہیں جب کہ چھٹے مصرع میں 'جنگل' کنایہ بعید ہے۔جس سے مراد ریگ زار، صحرا، کربلا، نینوا وغیرہ ہے۔ اس طرح یہ میر انیس کی مہارت زبان ہے کہ انہوں نے کنایہ قریب اور کنایہ بعید دونوں کو ایک بند میں یکجا کر دیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. کنایہ کیا ہے؟

8. کنایہ کی دو اہم قسمیں کیا ہیں؟

7.7 صنائع معنوی

اب تک علم بیان کی قسموں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کی خصوصیات پر گفتگو کی گئی یہاں پر ضروری ہے کہ علم بدیع سے متعلق بھی چند باتوں کا ذکر کر دیا جائے۔بدیع کو علم معنی بھی کہتے ہیں۔آپ نے دیکھا ہے کہ شعرا اپنے اشعار کو خوب صورت، دلکش اور تہہ دار بنانے کے لیے بعض صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں جن کا مقصد کلام میں معنوی خوبیاں پیدا کرنا ہوتا ہے۔انہیں اصطلاح میں صناع معنوی بھی کہتے ہیں۔علم معنی بہت وسیع علم ہے۔یہاں پر صرف چند صنائع معنوی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

7.7.1 صنعت تلمیح

کبھی اشعار پڑھتے وقت ہمارے سامنے ایسے نام اور مقامات آ جاتے ہیں جن سے کسی خاص واقعے، شخص یا

قصے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور شاعر ان کے حوالے سے اپنی بات کہنا چاہتا ہے۔ ایسے الفاظ کو صنعتِ تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً غالب کا مشہور شعر ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہاں پر ابن مریمؑ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت مریمؑ کے بیٹے تھے جس کی رعایت سے انہیں ابن مریم بھی کہا جاتا ہے۔ جنہیں اللہ نے یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ وہ مردے کو زندہ اور بیمار کو اچھا کر سکتے تھے۔ غالب کے شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ ابن مریم کوئی بھی ہو یعنی مردے کو زندہ کرنے کا معجزہ کسی کے پاس ہو، میرے دکھوں کا علاج کرے جب میں اسے ابن مریم جانوں گا۔ تلمیح کا یہی لطف ہے کہ ایک لفظ میں ایک بہت بڑی کہانی پوشیدہ ہوتی ہے۔ جس کی طرف ایک اشارے سے وہ اپنا کام نکال لیتا ہے۔ تلمیح کا ایک اور شعر دیکھیے۔

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش، پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہوگئیں

غالب

اس شعر میں حضرت یوسفؑ اور زلیخاؑ کے مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ لوگ اپنے رقیبوں سے ناخوش رہتے ہیں لیکن مصر کی عورتوں سے زلیخا خوش ہے کہ وہ حضرت یوسفؑ کے حسن میں محو ہوگئیں۔

حضرت یوسفؑ اور زلیخاؑ کا قصہ آپ کو معلوم ہوگا۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا حضرت یوسفؑ کی خوبصورتی پر فریفتہ ہوگئی جو اس کے ساتھ کی دوسری عورتوں کے لیے بڑی قابل اعتراض بات تھی ان کے اعتراضات کا جواب زلیخا نے یوں دیا کہ ان سب کو اپنے یہاں مدعو کیا اور ان کے سامنے ایک ایک چاقو اور نیبو رکھ دیا اور کہا کہ جب ان سے کہا جائے تو وہ نیبو کو کاٹ دیں۔ اس کے بعد اس نے حضرت یوسفؑ کو اندر بلوایا اور ان عورتوں سے نیبو کاٹنے کو کہا لیکن سب حضرت یوسفؑ کے حسن میں ایسا محو ہوگئیں کہ انہوں نے نیبو کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔

اردو میں تلمیح کی صنعت کا استعمال بہت عام ہے اور اکثر شعراء نے تلمیح سے اپنے اشعار کے دامن کو وسیع کیا ہے۔

7.7.2 مبالغہ

کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا' کسی شخص یا چیز کی تعریف یا برائی میں اتنا آگے بڑھ جانا کہ اس کا کوئی پہلو باقی نہ رہے' مبالغہ کہلاتا ہے۔

مبالغہ اردو شاعری کی ایک بہت عام صنعت ہے۔ قصیدہ اس کا خاص میدان ہے لیکن غزل میں بھی مبالغہ سے کام لینے میں شعرا کسی سے کم نہیں رہے ہیں۔ مبالغہ کا ایک خوبصورت شعر دیکھیے۔

وہی رنگ' وہی خوشبو' وہی نازک بدنی
پھول نے نقش اتارا ہے سراپا تیرا

7.7.3 غلو

مبالغہ کی یوں تو کئی قسمیں ہیں لیکن اس کی ایک قسم جو اکثر شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے وہ غلو ہے۔

حد سے زیادہ بڑھے ہوئے مبالغہ کو غلو کہتے ہیں۔ یعنی جو بات قرین قیاس نہ ہو۔ اردو قصائد میں مدح اور تشبیب کے بیان میں غلو کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً

جوش روئیدگی سبزہ سے کچھ دور نہیں
شاخ سے گاؤ زمیں کی بھی جو پھوٹے کونپل

سودا

یعنی ہر طرف سبزے کے اگنے کا ایسا جوش ہے کہ تعجب نہیں کہ اس گائے کی سنگ میں بھی کونپل نکل آئے جس کی سینگ پر یہ دنیا ٹکی ہوئی ہے۔ غلو کے سلسلے میں غزل کا بھی ایک شعر دیکھ لیجیے۔

فرشتے رونے لگے حشر میں ہوا کہرام
ترے شہید کا جب خونچکاں کفن دیکھا

شاد عظیم آبادی

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. تلمیح کسے کہتے ہیں؟ مثال دے کر واضح کیجیے۔

10. مبالغہ کی تعریف کیجیے۔

11. غلو سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

7.8 اجزائے شاعری

مطلع، قافیہ، ردیف اور مقطع اردو شاعری کے اہم اجزا یا عناصر ہیں۔ اردو شاعری کے مطالعے کے وقت یہ عناصر بار بار سامنے آتے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ذیل کی باتوں کو غور سے پڑھیے۔

7.8.1 مطلع

غزل یا قصیدے کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ غزل میں عام طور پر ردیف کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اگر غزل مردف یعنی ردیف والی ہے تو مطلع کے دونوں مصرعوں میں ردیف بھی ہوگی۔ اگر غیر مردف یعنی بغیر ردیف والی غزل ہے تو بغیر ردیف کے صرف قافیوں سے ہی مطلع مکمل ہو جائے گا یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مطلع کے دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ مثلاً

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

(میر)

اس مطلع میں ''ہمارا اور سارا'' قافیہ ہے اور جانے ہے'' ردیف

غزل کے دوسرے اشعار میں صرف دوسرے مصرعے میں قافیہ اور ردیف کا استعمال ہوگا۔ یہاں پر مطلع کی مزید مثالیں درج ذیل ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

(غالب)

اس مطلع میں ''نمایاں اور پنہاں'' قافیہ ہے اور ہوگئیں ردیف

غیر مردف مطلعوں کی یہ مثالیں دیکھیے۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن　　مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

(اقبال)

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد　　نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

ان مطلعوں میں دمن، چمن اور فریاد، آزاد قوافی ہیں ان میں کوئی ردیف نہیں ہے۔

7.8.2 مقطع

مقطع غزل یا قصیدے کے آخری شعر کو کہتے ہیں۔ جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کی شناخت شاعر کا تخلص ہے اگر آخری شعر میں شاعر نے تخلص نہیں نظم کیا تو وہ غزل کا آخری شعر تو ہوگا لیکن مقطع نہیں کہلائے گا۔ مثلاً

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے　　ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

(میر)

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر　　مومن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

(مومن)

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب　　آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

(حالی)

سچ جھوٹ کی خبر تو کسے لیکن اے فراق　　کوئی بیان درد سناتا ہے آج بھی

(فراق)

7.8.3 قافیہ

قافیہ شعر میں ترنم پیدا کرتا ہے اور اسے خوش آہنگ بناتا ہے۔ شاعری میں قافیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ قافیہ شعر کے مفہوم اور اس کے مطالب تک پہنچنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح قافیہ شعر کے معنوی حسن میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ مطلع اور مقطع کی گفتگو میں ہم یہ بات دیکھ چکے ہیں کہ قافیہ شعر کے آخر میں ردیف سے پہلے لایا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی شعرا ایک سے زائد قافیہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ دوسرا قافیہ مصرعے میں کہیں پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ قافیہ کی تعریف ہم اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔

قافیہ: مصرعے کے آخر میں ردیف سے پہلے آنے والے لفظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ جو ہم آہنگ الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً افسانہ، پیمانہ، میخانہ، دیوانہ یا جستجو، آرزو، گفتگو یا سفر، نظر، گھر، سر وغیرہ۔

اس طرح شاعر کسی بھی لفظ کو قافیہ کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

7.8.4 ردیف

شعر میں قافیہ کے بعد آنے والے لفظ یا الفاظ کو ردیف کہتے ہیں۔ اس کا استعمال مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور عام اشعار کے صرف دوسرے مصرعے میں ہوتا ہے۔ ردیف کی خوبی یہ ہے کہ وہ شعر کو خوش آہنگ بناتی ہے لیکن اس کا مقصد صرف خوش آہنگی پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ وہ شعر کے معنی سے اس طرح وابستہ ہوتی ہے کہ اسے اس سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جن اشعار میں ردیف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے مطالب کی تکمیل بغیر ردیف کے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً میر کے ان اشعار میں ردیف کی اہمیت کو دیکھیے۔

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے — گاہے بکا کرے ہے گاہے دعا کرے ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

ان اشعار میں ''کرے ہے'' ردیف ہے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ اگر ردیف کو ہٹا کر شعر کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کریں تو شعر نامکمل محسوس ہوگا۔ اسطرح ردیف شعر کی معنوی حیثیت کو مکمل کرتی ہے۔ مومن کے اشعار دیکھیے:

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس میں ''نہیں ہوتا'' ردیف ہے۔شعرانے ردیف میں کئی کئی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اوراس طرح اپنی شعری مہارت کا اظہار کیا ہے۔مثلاً سہ حرفی ردیف کی یہ مثالیں دیکھیے۔

یارب اس محبوب کو پھر ایک نظر دیکھیں گے ہم اپنی آنکھوں سے اسے یاں جلوہ گر دیکھیں گے ہم

.....

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

میر کے پہلے مطلع میں ''دیکھیں گے ہم'' اور دوسرے مطلع میں ''کی سی'' ردیف ہے۔اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ردیف ہماری شاعری کا اہم جز ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

12. مطلع کسے کہتے ہیں؟
13. ردیف وقافیہ کا فرق واضح کیجیے۔
14. مقطع کی تعریف لکھیے۔

7.9 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، تلمیح، مبالغہ، مطلع، مقطع، قافیہ وردیف کے بارے میں پڑھا۔انہیں شعری اصطلاحات بھی کہتے ہیں اور یہ علم بدیع اور علم بیان کا حصہ ہیں۔جب کسی چیز کی اچھائی یا برائی ظاہر کرنے کے لیے کسی دوسری چیز سے مثال دی جائے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔استعارہ کے معنی مستعار لینے کے ہیں کوئی لفظ جس کے اصل یا لغوی معنی مراد نہ لے کر نئے معنی مراد لیے جائیں تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔مجاز مرسل میں لفظ کو لغوی معنی کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔کنایہ سے مراد بات کو تفصیل سے نہ کہہ کر اشارے

میں بیان کرنے کے ہیں۔ شاعری میں ایسا لفظ جس سے کسی شخص یا واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہو صنعت تلمیح کہلاتا ہے۔ مثلاً ''ابن مریم ہوا کرے کوئی'' میں ابن مریم۔ مبالغہ اور غلو سے مراد کسی بات کو حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ تشبیہ، استعارے، مجاز مرسل اور کنایہ سے شعر کے حسن میں کس طرح اضافہ ہوتا ہے اور معنوی سطح پر شعر میں کتنے پہلو نظر آتے ہیں کسی کی ضرورت سے زیادہ تعریف اچھی نہ سہی لیکن ہمارے شعرا نے مبالغہ سے بھی شعر میں لطافت اور باریکی پیدا کی ہے۔

عناصر غزل یا اجزائے غزل میں آپ نے مطلع، مقطع، ردیف اور قافیہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ غزل اور قصیدہ کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ایک ہی ردیف و قافیے پر ختم ہوتے ہوں مطلع کہلاتا ہے۔ قافیہ شعر کے آخری میں لایا جاتا ہے۔ قافیہ سے مراد ہم آہنگ الفاظ ہیں۔ مثلاً نظر، گھر وغیرہ۔ ردیف سے مراد وہ الفاظ یا لفظ ہے جو شعر کے دوسرے یعنی آخری مصرعے میں قافیہ کے بعد آئے۔ مقطع غزل یا قصیدے کا آخری شعر ہوتا ہے۔ جس میں شاعر اپنا تخلص رکھتا ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں ہی نہیں بلکہ ہمعصر شاعری میں بھی ان عناصر کی بڑی اہمیت ہے۔ ان سے شعر کے اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ آزاد شاعری یا نثری شاعری کی بات کرتے ہیں۔ وہ بھی ہماری شاعری کی اصناف ہیں لیکن آج بھی بنیادی اہمیت اسی شاعری کی ہے۔ جس میں ردیف و قافیہ کا استعمال کیا جاتا ہے اور جن میں تشبیہ، استعارے، مجاز مرسل اور کنایے سے کام لیا جاتا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے یقیناً آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

7.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 کنایہ کی وضاحت کیجیے اور مثال دیجیے۔

2 ردیف کسے کہتے ہیں؟ شاعری میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

3 مطلع کی تعریف کیجیے اور مثالیں دیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 استعارہ کیا ہے؟ اور شعر میں اس سے کیا خوبی پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے ساتھ لکھیے۔

2. تلمیح کی تعریف کیجیے اور کسی شعر کے لفظ تلمیح کے واقعہ کو صراحت کے ساتھ لکھیے۔

3. مجاز مرسل اور استعارے میں کیا فرق ہے۔ وضاحت کے ساتھ لکھیے۔

7.11 فرہنگ

مفہوم	مطلب
نکتہ	خاص بات، باریکی
جہت	جانب، طرف، گوشہ
مشابہت	ایک شکل کے، یکسانیت
اشک فشانی	آنسو بکھیرنا، آنسو بہانا
سیاق	حوالہ

7.12 معاون کتابیں

1. ترقی اردو بیورو — درس بلاغت
2. شمیم احمد — اصناف سخن اور شعری ہئتیں

7.13 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. جب کسی چیز کی اچھائی یا برائی ظاہر کرنے کے لیے کسی دوسری چیز سے مثال دی جائے۔ تو اسے تشبیہ کہتے۔

2. اس صفت یا خوبی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اسے کسی چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں نازکی وجہ تشبیہ ہے یعنی شاعر نے لبوں کی نزاکتوں کی وجہ سے اسے گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی۔اس شعر میں نزاکت وجہ تشبیہ ہے۔

3. استعارہ کے معنی مستعار لینے کے ہیں یعنی کوئی لفظ جس کے اصلی یا لغوی معنی نہ لیے جائیں بلکہ اس کو نئے معنی میں استعمال کیا جائے۔مثلاً

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے

الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

4. خوشبو سے جن گلوں کی مہکتے تھے دو جہاں

کیوں اے صبا وہ پھول چمن سے کدھر گئے

5. مجاز مرسل میں لفظ کو اس کے لغوی یا حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

6. بینائی کا ختم ہو جانا مراد ہے۔

7. کنایہ کے معنی پوشیدہ یعنی چھپے ہوئے اشارے کے ہیں کنایہ میں کسی بات کو تفصیل سے کہنے کے بجائے اشارے میں بیان کیا جاتا ہے کنایہ جس کی تعریف مقصود ہو اس کی ذات یا صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

8. (1) کنایۂ قریب (2) کنایۂ بعید

9. شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال جن سے کسی خاص واقعے، شخص یا قصے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔تلمیح کہلاتا ہے۔مثلاً :

ابن مریم ہوا کرے کوئی

مرے دکھ کی دوا ہوا کرے کوئی

10. کسی بات کو بڑھا جڑھا کر بیان کرنا مبالغہ کہلاتا ہے۔

11. مبالغہ کی ایک قسم غلو ہے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے مبالغہ کو غلو کہتے ہیں۔

12. غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔

13. مصرعے کے آخر میں ردیف سے پہلے آنے والے الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ مثلاً میخانہ، افسانہ، پیمانہ، دیوانہ وغیرہ۔ شعر میں قافیہ کے بعد آنے والے الفاظ کو ردیف کہتے ہیں یا جن الفاظ کی شعر کے آخر میں تکرار ہوتی ہے۔ ردیف کہلاتے ہیں۔ مثلاً میر کی غزل

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

میں ''کی سی ہے'' ردیف ہے۔

14. مقطع اس شعر کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔

بلاک نمبر-3

انشائیہ

اکائی ۸۔انشائیہ کی تعریف
اکائی ۹۔محمد حسین آزاد: سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ
اکائی ۱۰۔عبدالحلیم شرر: دیہات کی زندگی

یہ بلاک درج بالا تین اکائیوں پر مشتمل ہے اور جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے اس بلاک میں اردو انشائیہ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ بلاک کی پہلی اکائی انشائیہ کی تعریف کے عنوان سے پیش کی گئی ہے، جس سے آپ انشائیہ کے بنیادی نکات سے واقف ہو جائیں گے۔ دوسری اور تیسری اکائی میں اردو کے مشہور انشائیہ نگار محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر جیسی قد آور شخصیات کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے انشائیوں بالترتیب ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' اور ''دیہات کی زندگی'' کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان اکائیوں کے مطالعے سے آپ انشائیہ نگاری کے بارے میں اور ساتھ ہی شامل نصاب دونوں انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات اور ان کے زبان و اسلوب و انداز بیان سے بھی اچھی طرح واقف ہو سکیں گے۔ اگر آپ ان اکائیوں کا کئی بار مطالعہ کریں گے تو ہمیں یقین ہے کہ آپ اس کو بخوبی سمجھ لیں گے۔

اکائی 8 : انشائیہ کی تعریف

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 انشائیے کی تعریف

1.4 انشائیے کا آغاز وارتقاء

1.5 انشائیے کا موضوع

1.6 انشائیے کا اسلوب یا طرز بیان

1.6.1 محمد حسین آزاد 1.6.2 پطرس بخاری

1.6.3 ابوالکلام آزاد 1.6.4 خواجہ حسن نظامی

1.6.5 احمد جمال پاشا 1.6.6 مشتاق احمد یوسفی

1.7 انشائیہ اور دوسری نثری اصناف

1.8 انشائیے کی دیگر خصوصیات

1.9 خلاصہ

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.11 فرہنگ

1.12 معاون کتابیں

1.13 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ انشائیہ کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کریں گے۔ اس کے تحت انشائیے کی تعریف، تاریخ، موضوع اور اسلوب کا تعارف کراتے ہوئے اس کی دیگر خصوصیات مثلاً شگفتگی، لطافت، مسرت، رفعت، بصیرت، طنز، مزاح، عدم تکمیلیت، ظاہری بے ربطی، دلچسپی اور غیر روایتی طریقہ کار پر روشنی ڈالی جائے گی اور اردو میں انشائیہ نگاری پر اظہار رائے کرتے ہوئے اردو کے نمائندہ انشائیہ نگاروں کا ذکر بھی کیا جائے گا۔

اس اکائی کے مطالعے سے آپ انشائیہ کی بنیادی خصوصیات سے نہ صرف واقف ہو جائیں گے بلکہ عمومی مطالعے میں بھی انشائیے کو پہچاننے میں آپ کو کوئی دشواری نہ ہوگی اور اس لطیف صنفِ ادب کے تئیں آپ کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔

1.2 تمہید

انشائیہ اردو ادب کی ایک لطیف، دلچسپ اور مقبول نثری صنف ہے۔ اردو ادب میں اس صنف یعنی انشائیے کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کا شمار اُردو کی جدید اصناف میں ہوتا ہے۔ عہد سرسید میں تنقید، سوانح، تاریخ، ناول اور جدید نظم کے ساتھ ہی انشائیے کا آغاز ہوا۔ سرسید احمد اور ان کے رفقاء محسن الملک، وقار الملک، الطاف حسین حالؔی اور محمد حسین آزادؔ کے مضامین (نیرنگِ خیال) میں اس صنف کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ نظم جدید کی طرح اس صنف کی تشکیل و تکمیل میں انگریزی ادب کا بڑا ہاتھ ہے۔ انگریزی میں اس صنف کو Essay کہا جاتا ہے، بعض ناقدین اسے Light Essay بھی کہتے ہیں۔

1.3 انشائیے کی تعریف

انشائیہ ایک آزاد صنف ہے یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس کا کوئی خاص موضوع یا خاص اسلوب متعین نہیں ہے اس لیے اس کی تعریف اس طرح نہیں کی جاسکتی جس طرح ناول، افسانہ، ڈراما یا دیگر اصناف ادب کی تعریف کی جاتی

ہے۔ یہ صنف مقالہ، خاکہ، روداد، رپورتاژ، کالم، روزنامچہ جیسی نثری تحریروں سے بھی مختلف ہے۔ اس کی تعریف میں مختلف ادیبوں اور نقادوں نے الگ الگ قسم کی باتیں کہی ہیں۔ بعض کے خیال میں یہ فلسفیانہ خیال آرائی ہے تو بعض کے نزدیک انشا پردازی کا طلسم۔ کچھ لوگ اسے محض ذاتی تاثر پر محمول کرتے ہیں۔ اس کی تشکیل میں فکر انگیز خیال آفرینی، لطافت، شگفتگی اور تخلیقی انداز بیان کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔ اسے خیال کی رو اور ذہنی ترنگ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ انشائیہ اپنے آپ میں ایک نامکمل اور دلچسپ تحریر ہے اور وہ اپنی انہیں منفرد و مخصوص خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی خصوصیات اس کی مقبولیت کا باعث ہیں۔

1.4 انشائیے کا آغاز وارتقاء

اردو میں جدید نظم کی طرح انشائیے کی ابتدا بھی سرسید کے عہد میں انگریزی کے زیر اثر ہوئی۔ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ نظم جدید اور انشائیے کی ابتدا کا زمانہ اور ان دونوں اصناف کا آغاز کرنے والے اہلِ قلم کم وبیش ایک ہی ہیں۔ جس طرح جدید نظم کی ابتدا کا سہرا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے سر ہے، اسی طرح انشائیے کے اولین نقوش بھی انہیں مصنفین کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ 'نیرنگ خیال' میں شامل محمد حسین آزاد کے تمثیلی مضامین اس کی عمدہ مثال ہیں۔ (تمثیل کو انگریزی میں Allegory کہا جاتا ہے) محمد حسین آزاد کے بعد سادہ اسلوب میں انشائیے لکھے گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف پر نکھار آتا گیا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ سرسید احمد، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، مہدی افادی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالحلیم شرر، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، پطرس بخاری، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی، کنھیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، نظیر صدیقی، وزیر آغا وغیرہ کا شمار اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے 'نگار' اور وزیر آغا نے 'اوراق' کے ذریعے انشائیے کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. انشائیہ کسے کہتے ہیں؟
2. اردو میں انشائیے کی ابتدا کب ہوئی؟

1.5 انشائیے کا موضوع

انشائیہ کسی خاص موضوع کا پابند نہیں ہے۔ دنیا کی ہر شئے اور زندگی کے ہر پہلو پر انشائیہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ کسی سنجیدہ مقالے کی طرح اس کے دلائل میں منطقی ربط و تسلسل نہیں ہوتا۔ اس میں ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا اس موضوع سے بہ ظاہر تعلق نہیں ہوتا جسے بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے' اسی لیے بعض ادیبوں نے اس دلچسپ صنفِ ادب کو ایک ایسے کبوتر کی مانند قرار دیا ہے جسے اپنی چھتری کی پہچان نہ ہو۔ انشائیہ نگار موضوع کے صرف انہیں پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جن سے قاری کی مسرت و بصیرت کے در کھل جائیں۔ یہ روشنی بھی واضح اور صاف نہیں ہوتی۔ اس میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کسی بھی چھوٹی سی بات کو موضوع بنا کر باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جاتا ہے اور قاری کو لطف و انبساط کے ساتھ غور و خوض پر بھی مائل کرتا ہے۔ وہ اگرچہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور مشورہ بھی نہیں دیتا لیکن اس کی کوشش یہ ضرور ہوتی ہے کہ قاری اسے پڑھ کر دیر تک سوچتا اور محظوظ ہوتا رہے۔ یہی ایک اچھے انشائیے کی پہچان ہے۔

1.6 انشائیے کا اسلوب یا طرزِ بیان

انشائیہ' شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اس لیے اس کے اسلوبِ بیان میں فطری طور پر شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اس میں فلسفیانہ موشگافیاں' منطقی استدلال' پند و نصائح' سنجیدہ مباحث یا خشک تعلیم و تبلیغ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

انشائیہ جس طرح کسی ایک موضوع کا پابند نہیں اسی طرح کسی ایک اسلوب کا بھی پابند نہیں ہوتا۔ اس کا ڈھانچہ ڈھیلا ڈھالا اور لچک دار ہوتا ہے' جسے انشائیہ نگار اپنے مزاج' موڈ اور موضوع کی مناسبت سے اختیار کرتا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب خود اپنے آپ کو انشائیہ نگار کے مزاج و موضوع کے موڈ میں ڈھال لیتا ہے۔ انشائیے کے اسلوب یا اندازِ بیان میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ انشائیے میں بات میں بات پیدا کرنے اور موضوع کے مختلف پہلوؤں

کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش تازگی کے احساس کو زائل نہیں ہونے دیتی۔ اس عمل کے نتائج قاری کے لیے نہایت دلچسپ اور پر لطف ہوتے ہیں۔ انشائیہ اپنی انہیں اسلوبیاتی خصوصیات کی وجہ سے انوکھے پن کا احساس دلاتا ہے۔ اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ اس کا لطف بھی لیجیے اور اس کے طرزِ تحریر کی خصوصیات، امتیازات اور فرق کو محسوس کیجیے۔

1.6.1 محمد حسین آزاد

''ایک شخص سوکھا، سہما، دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا۔ اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا، جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنات کی تصویریں زردوزی سے کڑھی ہوئی تھیں۔ جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔''

(''انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا'')

1.6.2 پطرس بخاری

''پیدل ...... ! تم پیدل چلنے کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک پاؤں ضرور زمین پر رہے، یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا یہی طریقہ رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں دوسرا اٹھاتا ہوں، ایک آگے ایک پیچھے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا حواس بے کار ہوجاتے ہیں، تخیل مرجاتا ہے۔''

(''مرحوم کی یاد میں'')

1.6.3 ابوالکلام آزاد

''اب گیارہ بج رہے تھے میں کھانے کے لیے چلا گیا۔تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کے رہ گیا۔کیا دیکھتا ہوں کے سارا کمرہ پھر حریفوں کے قبضے میں ہے اور اس اطمینان وفراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں' جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا۔گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔اپنی وہمی فتح مندیوں کا یہ حسرت ناک انجام دیکھ کر بے ساختہ ہمت نے جواب دے دیا۔''

(''چڑیا چڑے کی کہانی'')

1.6.4 خواجہ حسن نظامی

''یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔رات کی نیند حرام کردی ہے۔ہندو' مسلمان' عیسائی' یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ہر روز اس کے مقابلے کے لیے مہمیں تیار ہوتی ہیں' جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔''

(''مچھر'')

1.6.5 احمد جمال پاشا

''میزبان اس حواس باختہ انسان کو کہتے ہیں جو عموماً اپنے سے بڑے یا اہم آدمی کو کسی خاص موقع پر شرفِ میزبانی بخشنے کے بہانے گھر بھر کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کرانے کا وسیع تجربہ رکھتا ہو۔اس کے ساتھ گھر والوں کی وہی حالت ہوتی ہے جو گیہوں کے ساتھ گھُن کی ہوا کرتی ہے۔گھر بھر میزبانی کی

چکی میں پس کر اچھا خاصا گھن چکر بن جاتا ہے۔''

(''میز بان بے زبان'')

1.6.6 مشتاق احمد یوسفی

''تو کوئی نہ ہو تیماردار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیماردار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ توبہ کیجیے! مرنے کا یہ اکھل کُھرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی نہ آیا۔ ہوسکتا ہے کہ غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا اور سچ پوچھیے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصہ ہے۔ اسی بنا پر غالب کی نفاست پسند طبیعت نے 1277 ہجری میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسرِ شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزومند تھے۔''

(''پڑیے گر بیمار.....'')

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

3. انشائیے کا موضوع کیا ہے؟
4. انشائیے کی انفرادیت کیا ہے؟
5. انشائیے کا اسلوب کیسا ہوتا ہے؟
6. انشائیے کے اسلوب کی تین خصوصیات بیان کیجیے۔

1.7 انشائیہ اور دوسری نثری اصناف

انشائیہ ایک منفرد صنف ادب ہے۔ اس صنف کو افسانہ سرائی، قصہ گوئی اور ڈرامائیت سے کوئی سروکار نہیں۔ تحقیق و تنقید سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ناول، افسانہ اور ڈرامے میں غیر موجود کو خلق کیا جاتا ہے جب کہ انشائیے میں موجود کو نئے پہلوؤں اور نئے زاویوں سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح خاکہ نگاری، سیرت

نویسی کی بھی انشائیے میں کوئی گنجائش نہیں' البتہ کسی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

بات میں بات پیدا کرنا انشائیہ نگار کا خاص وصف ہے۔ کالم نویس بھی بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر جانتا ہے مگر دونوں کے طریقۂ کار میں اور مقصد تحریر اور انداز تحریر میں واضح فرق ہوتا ہے۔ کالم نویس اخباری پالیسی' وقت کے تقاضے یا کسی خاص حکمت عملی کے تحت کالم لکھتا ہے۔ جب کہ انشائیہ نگار کا ذہن اس طرح کے عوامل سے یکسر پاک ہوتا ہے۔ اس کی انفرادیت اپنا راستہ الگ بناتی ہے۔ جس میں دیگر اصناف کا عکس نظر تو آ سکتا ہے۔ مگر مکمل دخل کی گنجائش نہیں ہوتی۔

انشائیہ کیونکہ ایک پرلطف اور دلچسپ صنف ہے' اس لیے شگفتگی اس کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ طرز اسلوب کے بجائے وہ طنزیہ اور مزاحیہ اسالیب سے جزوی مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔ طنز میں اصلاح کا پہلو' سنجیدہ مقصد کے حصول کا جذبہ یا کبھی کبھی دلآزاری کا پہلو بھی کارفرما ہوتا ہے جس کے سبب طنز کے عمل میں نشتریت کا عمل بھی شامل ہو جاتا ہے جب کہ انشائیے کو نشتریت یا تلخی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھے طنز نگار کے یہاں طنز ایک سہارے کا کام کرتا ہے' مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس مزاح کا معاملہ بھی ہے جو سطحیت کی طرف لے جاتا ہے اور جس میں بات ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی۔ انشائیہ نگار اس نوع کے مزاح سے اجتناب کرتا ہے اور یہی باتیں انشائیے کو دیگر اصناف سے منفرد بناتی ہیں اور اس کی علاحدہ پہچان قائم کرتی ہیں۔

1.8 انشائیے کی دیگر خصوصیات

- انشائیہ شخصی ردعمل کا اظہار ہے۔
- انشائیہ ایک دلچسپ اور لطیف صنف ادب ہے۔
- انشائیہ' انشائیہ نگار کے گہرے' مشاہدے اور تجربے کے تاثراتی ردعمل کا آئینہ ہوتا ہے۔
- خیال آفرینی' انشائیے کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

- انشائیے میں اہم اور غیر اہم تمام مرحلے خوش طبعی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔
- انشائیہ وسعت اور رفعت کا احساس دلاتا ہے۔
- انشائیہ مسرت اور بصیرت بہم پہنچاتا ہے۔
- انشائیے کی ایک اہم خصوصیت اس کی عدم تکمیلیت ہے۔
- انشائیے کی ایک خوبی اختصار بھی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. انشائیہ اور قصہ گوئی میں کیا فرق ہے؟
8. انشائیہ اور کالم میں کیا فرق ہے؟
9. انشائیہ اور طنز و مزاح کے اسلوب میں کیا فرق ہے؟
10. انشائیے میں عدم تکمیلیت سے کیا مراد ہے؟

1.9 خلاصہ

انشائیہ اردو ادب کی ایک جدید اور مقبول صنف ہے۔ اردو ادب میں اس صنف یعنی انشائیے کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کا شمار اُردو کی جدید اصناف میں ہوتا ہے۔ انشائیہ ایک آزاد صنف ہے یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس کا کوئی خاص موضوع یا خاص اسلوب متعین نہیں ہے اس لیے اس کی تعریف اس طرح نہیں کی جاسکتی جس طرح ناول، افسانہ، ڈراما یا دیگر اصناف ادب کی تعریف کی جاتی ہے۔ اردو میں جدید نظم کی طرح انشائیے کی ابتدا بھی سرسید کے عہد میں انگریزی کے زیر اثر ہوئی۔ انشائیہ کسی خاص موضوع کا پابند نہیں ہے۔ دنیا کی ہر شئے اور زندگی کے ہر پہلو پر انشائیہ لکھا جاسکتا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ کسی سنجیدہ مقالے کی طرح اس کے دلائل میں منطقی ربط و تسلسل نہیں ہوتا۔ انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اس لیے اس کے اسلوبِ بیان میں فطری طور پر شگفتگی اور لطافت پائی

جاتی ہے۔اس میں فلسفیانہ موشگافیاں، منطقی استدلال، پند ونصائح، سنجیدہ مباحث یا خشک تعلیم وتبلیغ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

سرسید احمد اوران کے رفقاء محسن الملک، وقار الملک، الطاف حسین حالؔی اور محمد حسین آزادؔ کے مضامین (نیرنگِ خیال) میں اس صنف کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔دیگر اہم انشائیہ نگاروں میں مولوی ذکاءاللہ، مہدی افادی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالحلیم شررؔ، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی، کنھیالال کپور، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، نظیر صدیقی، وزیر آغا وغیرہ شامل ہیں۔

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں تحریر کیجیے:

1. انشائیہ کسے کہتے ہیں؟
2. انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے:

1. انشائیے کی تعریف بیان کیجیے اور اس کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔
2. انشائیے کے اسلوب کی خصوصیات تحریر کیجیے۔
3. انشائیہ، ناول، افسانہ، ڈراما، خاکہ، سوانح اور کالم نویسی سے کس طرح مختلف ہے؟ واضح کیجیے۔

1.11 فرہنگ

اسلوب	طریقہ، انداز
شگفتگی	کھلاوٹ، تازگی، شادابی
لطافت	نرمی، پاکیزگی، تازگی

رفعت	بلندی، اونچائی
بصیرت	رہنمائی، یقین، قلب ونظر کی روشنی
عدم تکمیلیت	نامکمل ہونا، ادھورا پن
لطیف	نرم، پاکیزہ
نقوش	نقش کی جمع، نشانات
تشکیل	شکل پانا، شکل بنانا
تکمیل	مکمل ہونا، کامل کرنا
ناقدین	ناقد کی جمع، تنقید کرنے والے
متعین	طے کیا ہوا، مقرر کیا ہوا
خیال آرائی	خیال کو سجا سنوار کر پیش کرنا، خوش خیالی
محمول	گمان کیا ہوا
خیال آفرینی	خیال کو نئے رنگ وروپ دینا، خیال سے خیال پیدا کرنا
تخلیق	پیدا کی ہوئی، پیدا کرنا
تمثیلی مضامین	رمزیہ مضامین، وہ مضامین جن میں غیر جاندار کو جاندار بنا کر پیش کیا گیا ہو
فلسفیانہ موشگافیاں	فلسفی کے انداز میں بال کی کھال نکالنا
استدلال	دلیل لانا، دلیل چاہنا
پند	نصیحت
نصائح	نصیحت کی جمع، بھلی باتیں، تجربے کی باتیں، اچھی باتیں
انبوہ	بھیڑ، جمع

دیوزادوں	دیو کی اولادوں، دیو، لحیم و شحیم، لمبے تڑنگے
جنات	جن کی جمع
زردوزی	کارچوبی
ہیبت	ڈر، خوف
کام جوئی	کارگزاری، کامرانی، کارکردگی، کام کا جذبہ
حواس باختہ	جس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہوں، بدحواس
شرفِ میزبانی	میزبانی کی عزت
افسانہ طرازی	افسانہ بنانا، بات کا بتنگڑ بنانا
اسالیب	اسلوب کی جمع، طرز، طریقہ، اسٹائل
مقصود بالذات	خاص اسی مقصد کے لیے، جو بذات خود مقصد ہو
سطحیت	جس میں گہرائی نہ ہو، اوچھاپن، اوپری پن، پھکڑ پن، غیر معیاری، ہلکا پن
اجتناب	پرہیز، بچاؤ، دوری اختیار کرنا
ردعمل	وہ عمل جو کسی عمل کے نتیجے میں کیا جائے (Reaction)

1.12 معاون کتابیں

1. اردو کا بہترین انشائی ادب — ڈاکٹر وحید قریشی
2. اردو کے بہترین انشائیے — جمیل آذر
3. انشائیہ اور انشائیے — سید محمد حسنین
4. اردو انیسز — سید ظہیر الدین مدنی
5. اردو ادب میں طنز و مزاح — ڈاکٹر وزیر آغا

1.13 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. انشائیہ ایک اسلوب کا نام ہے مگر یہ ایک ایسا آزاد اسلوب ہے جس کا کوئی موضوع بھی متعین نہیں۔
2. اردو میں انشائیے کی ابتدا عہد سرسید میں ہوئی۔
3. انشائیے کا کوئی ایک موضوع مقرر نہیں۔ زندگی کے کسی بھی پہلو پر انشائیہ لکھا جا سکتا ہے۔
4. انشائیے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کی ظاہری بے ربطی اور عدم تکمیلیت کے باوجود خیال آفرینی، کشادگی اور رفعت کا احساس قائم رہتا ہے اور حصول مسرت و بصیرت کے مراصل خوش اسلوبی اور خوش طبعی کے ساتھ طے کئے جاتے ہیں۔
5. انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اس لیے اس کے اسلوب میں شگفتگی، بے ساختگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔
6. تازگی، لچک اور خیال آفرینی۔
7. قصہ کہانی میں غیر موجود کو خلق کیا جاتا ہے جبکہ انشائیہ میں موجود کو نئے نئے زاویوں سے دکھایا جاتا ہے۔
8. کالم نویس، اخبار کی پالیسی یا کسی خاص حکمت عملی کے تحت کالم لکھتا ہے جبکہ ایک انشائیہ نگار حصول مسرت و بصیرت کا خواہاں ہوتا ہے۔
9. طنز میں اصلاح کی خواہش یا دلآزاری کا پہلو نکلتا ہے اور مزاح کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہے جبکہ انشائیہ مسرت بہم پہنچانا اور سوچنے پر مائل کرنا چاہتا ہے۔
10. انشائیے میں عدم تکمیلیت سے یہ مراد ہے کہ بات کو مکمل کرنا یا انجام تک پہنچانا ضروری نہیں۔ اسے پڑھ کر قاری کو تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ قاری تشنگی کی اس آگ کو غور و فکر کے پانی سے بجھاتا ہے۔

اکائی 9 : محمد حسین آزاد: 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی

2.4 محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات

2.5 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری

2.6 انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا متن (اقتباس)

2.7 انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا تجزیہ

2.8 خلاصہ

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

2.10 فرہنگ

2.11 معاون کتابیں

2.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ آپ محمد حسین آزاد کا بحیثیت انشائیہ نگار کے تعارف حاصل کرسکیں۔ محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کریں۔ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ''نیرنگِ خیال'' سے متعارف ہوسکیں اور محمد حسین آزاد کے منفرد اسلوب کو جان سکیں۔ آپ اس اکائی کے مطالعے سے انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کے اندازِ بیاں کا جائزہ بھی لے سکیں گے۔

2.2 تمہید

آپ نے انشائیہ نگاری کے بارے میں پڑھا ہے۔ انشائیہ دراصل مضمون کی ہی ایک قسم ہے۔ مضمون میں سنجیدہ موضوعات پر منطقی انداز میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن مضمون کے برخلاف انشائیہ میں انشائیہ نگار عام طور سے موضوعات پر اظہار خیال کے ساتھ فکر و فلسفے کے اہم نکات بیان کرتا ہے۔ یہ نہایت ہلکے پھلکے مضامین ہوتے ہیں۔ تاہم انشائیہ نگار اپنے شخصی احساسات اور تاثرات شامل کر کے اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ یعنی بات سے بات پیدا کر کے بڑی اہم، فکر انگیز اور معنویت سے پر باتیں پیش کرتا ہے۔

محمد حسین آزاد سے قبل ماسٹر رام چندر اور سرسید احمد خاں نے مضامین لکھے۔ ان دونوں نے علمی، ادبی و سائنسی اور اصلاحی مضامین لکھے۔ جبکہ انشائیہ کے لیے شگفتہ بیانی اور تمثیلی انداز ضروری ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد وہ پہلے انشا پرداز ہیں جن کے یہاں یہ خوبیاں ملتی ہیں۔ محمد حسین آزاد کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی اُردو کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔

2.3 محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی

محمد حسین نام تھا اور آزاد تخلص کرتے تھے۔ 10 جون 1830ء بروز جمعرات دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد باقر تھا۔ محمد باقر ایک اچھے صحافی تھے۔ وہ شمالی ہند کے اولین اخبار ''اُردو اخبار'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ آزاد چار سال کے ہوئے کہ ان کی والدہ امانی خانم کا انتقال ہو گیا۔ تب محمد باقر اور ان کی بہن یعنی آزاد کی پھوپھی نے ان کی پرورش کی۔ خصوصاً محمد باقر نے آزاد کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1847ء میں ''دہلی کالج'' میں داخل ہوئے۔ یہ اس دور کا مشہور کالج تھا۔ اس کالج میں نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ آزاد کا شمار کالج کے ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔ انہیں کالج سے وظیفہ بھی ملا کرتا تھا۔ آزاد نے شاعری شروع کی تو ابراہیم ذوق سے اصلاح لینے لگے۔ کئی سالوں تک آزاد

ذوق کے شاگرد رہے۔ بعد میں ذوق کے دیوان کو آزاد ہی نے مرتب کیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں آزاد کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے والد محمد باقر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں شہید کر دیے گئے۔ آزاد کا گھر بار لوٹ لیا گیا۔ اسی سال ان کی ایک سالہ بچی کا انتقال ہو گیا۔

دلی کی تباہی کے بعد آزاد ادھر ادھر تلاش روزگار میں بھٹکتے رہے۔ کبھی لاہور، کبھی پنجاب میں مختلف مقامات پر خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر کار پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد انہیں معاشی فراغت نصیب ہوئی۔ وہیں میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ مل کر ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ 1867ء میں آزاد اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ مولانا الطاف حسین حالی بھی ان کے شریک کار تھے۔ 1870ء میں کرنل ہالرائیڈ نے انہیں گورنمنٹ کالج میں عربی و فارسی کا پروفیسر مقرر کیا۔ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات پر 1887ء میں ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا۔

1857ء کی ہلاکت خیزی، والد کی شہادت، اپنی دختر امت السکینہ کی موت، پھر 1877ء میں ان کی پھوپھی کا انتقال اور اسی زمانے میں ان کے لڑکوں کی وفات نے آزاد کے ذہن کو منتشر کر دیا۔ اس عرصے میں انہوں نے متعدد نوحے، سلام، مناجات اور رمرثیے لکھے لیکن وہ سب برباد ہو گئے۔ تمام ناگہانی حالات نے ان کے ذہن کو متاثر کر دیا جس کی وجہ سے وہ آخری عمر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور بالآخر 22 جنوری 1910ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. محمد حسین آزاد کس سنہ میں پیدا ہوئے؟
2. محمد حسین آزاد کے والد کس اخبار کے ایڈیٹر تھے؟
3. شاعری میں انہوں نے کس سے اصلاح لی؟
4. آزاد نے کس کے ساتھ ملک کر ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی؟
5. محمد حسین آزاد کو علمی و ادبی کارناموں پر کس خطاب سے نوازا گیا؟
6. آزاد کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

2.4 محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات

محمد حسین آزاد اُردو ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں جدید اُردو شاعری کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ محمد حسین آزاد سے قبل شاعری صرف غزل کے عشقیہ موضوعات اور مثنویوں کے داستانوی قصوں تک محدود تھی۔ جبکہ آزاد نے مختلف موضوعات پر کارآمد نظمیں لکھ کر اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا۔ آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر میں انہوں نے ایسی تصانیف چھوڑی ہیں جو انہیں شہرت دوام بخشی ہیں۔ ان کا منفرد اسلوب اور طرز تحریر ان سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہو گیا۔ ان کی تحریر کے بانکپن کی کوئی بھی تقلید نہ کر سکا۔

''قصصِ ہند'' آزاد کا پہلا کارنامہ ہے۔ سخندانِ فارس' فارسی زبان و ادب سے متعلق تصنیف ہے۔ آزاد کی تمثیلی انشائیوں کا مجموعہ ''نیرنگ خیال'' دو حصوں میں شائع ہوا۔ ''دربار اکبری'' میں تاریخ ہند کے سنہرے دور کو موضوع بنایا گیا۔ ''سیرِ ایران'' میں ایران کے سفر کے تجربات بیان کیے گئے۔ وہیں 'نظم آزاد' آزاد کے نئے تصورِ ادب کی ترجمان ہے۔ ''نصیحت کا کرن پھول'' پنڈت من پھول کی فرمائش پر لکھی گئی۔ آزاد کی شاہکار تصنیف جس نے انہیں شہرت عطا کی وہ ہے 'آب حیات'۔ 'آب حیات' اُردو شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس میں ادبی تاریخ کی خصوصیتیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ان کے منفرد اسلوب کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتی ہے۔

محمد حسین آزاد جہاں نثر میں متعدد تصانیف کی بنا پر بلند حیثیت رکھتے ہیں' وہیں اُردو شاعری میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ''انجمن پنجاب'' کی بدولت انہوں نے اُردو میں نظم نگاری کو فروغ دیا اور نئے نئے موضوعات پر نظمیں لکھ کر شاعری میں کئی جہتیں تلاش کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مثنویاں بھی لکھیں جو اپنی سادہ بیانی اور مختلف موضوعات کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی انہوں نے درسی کتابیں تصنیف کیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. محمد حسین آزاد کو کس شاعری کا بانی مانا جاتا ہے؟

8. آزاد کا پہلا کارنامہ کون سا ہے؟
9. آزاد کے تمثیلی انشائیوں کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟
10. ''دربار اکبری'' کا موضوع کیا ہے؟
11. ایران کے سفر کے تجربات کو آزاد نے کس کتاب میں قلم بند کیا ہے؟
12. آزاد کی وہ کون سی تصنیف ہے جس نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا؟۔
13. جدید ادب سے متعلق آزاد کے تصورات کس کتاب میں ملتے ہیں؟
14. ''نصیحت کا کرن پھول'' کس کی فرمائش پر لکھی گئی؟

2.5 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری

محمد حسین آزاد کا دور اصلاحی ادب کا دور تھا۔ اس دور میں سرسید اور ان کے رفقاء اصلاحی ادب کی ترویج کر رہے تھے۔ مختلف موضوعات پر سنجیدہ مضامین لکھے جا رہے تھے۔ ان مضامین میں انشائیہ کی خصوصیات نہیں ملتیں۔ ماسٹر رام چندر، ذکاء اللہ، نذیر احمد اور سرسید کے مضامین میں اصلاحی مقصد اور راست انداز نمایاں تھا۔ جب کہ محمد حسین آزاد وہ پہلے مضمون نگار ہیں جن کے مضامین میں انشائیہ کے نقوش ملتے ہیں۔ آزاد کی شاعرانہ طبیعت اور انفرادیت نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اپنے افکار و تصورات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر اظہار کرنے کی کوشش کی۔

''نیرنگِ خیال''، محمد حسین آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں میں شائع ہوا۔ انشائیوں کا حصہ اول 1881ء میں شائع ہوا۔ اس میں آٹھ انشائیہ شامل ہیں۔ حصہ دوم میں پانچ انشائیہ شامل ہیں۔ حصہ دوم کو آزاد کے انتقال کے بہت عرصے بعد آغا محمد طاہر (نبیرہ آزاد) نے شائع کروایا۔

''نیرنگِ خیال'' کی اشاعت نے اُردو انشا پردازی میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ''نیرنگِ خیال'' اپنے دل کش اسلوب کی وجہ سے اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ کیونکہ آزاد نے مختلف موضوعات پر تمثیلی انداز میں جس

طرح سے اظہار خیال کیا ہے اسی کی بنا پر اُردو میں تمثیل نگاری کی ایک منفرد مثال قائم ہوگئی۔

آزاد سے قبل ملا وجہی نے اپنی تصنیف ''سب رس'' میں تمثیلی پیرایے کو اپنایا تھا۔ لیکن وہ داستانوی صنف تھی اور اس میں طوالت تھی۔ تاہم آزاد نے مختصر مضامین میں جس خوبصورتی سے تمثیل کو ڈھالا ہے یہ ان ہی کی خوبی ہے۔

تمثیل یا رمزیہ کو انگریزی میں "Allegory" کہتے ہیں۔ اس صنفِ ادب میں غیر مادی تصورات کو مادی کرداروں کی شکل میں فرض کرلیا جاتا ہے۔ اور ان کی خصوصیات کو مادی کرداروں کی صورت میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک قصہ بیان ہوتا ہے۔ اس طرح سے کہ یہ قصہ دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ ایک تو اس کے ظاہری معنی ہوتے ہیں۔ دوسرے تمثیلی مطالب میں گہرے معنی پنہاں ہوتے ہیں۔ اس صنف ادب کا مقصد راست اخلاقی تعلیم کے بجائے تمثیلی قصے کے روپ میں اخلاقی تعلیم دینا زیادہ کارگر سمجھا جاتا تھا۔

''نیرنگِ خیال'' محمد حسین آزاد کے تمثیلی انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے تمام مضامین انگریزی کے تمثیلی مضامین سے ماخوذ ہیں، ترجمہ نہیں ہیں۔ جس کا اعتراف خود آزاد نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں۔ اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔''
>
> (''نیرنگ خیال''۔ دیباچہ۔ ص 5)

ظاہر ہے آزاد نے انگریزی مضامین کو سن کر اس سے استفادہ کیا اور اپنی ذہنی اپج سے انشائیوں کے روپ میں پیش کیے۔ انہوں نے انگریزی کے مشہور مضمون نگار Addison اور Johnson کے مضامین سے استفادہ کیا۔ یہ ضرور ہے کہ آزاد نے انگریزی انشاپردازوں کے خیالات سے چراغِ شوق روشن کیے۔ تاہم اُردو کے مزاج اور ہندوستانی تاریخ و تہذیب کو اپنے مدنظر رکھا اس کے لیے انہیں اصل سے انحراف بھی کرنا پڑا۔

''نیرنگ خیال'' کے مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں وعظ و نصیحت کے خشک مضامین کو قصہ کا

روپ دے کر دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔ اس میں آزاد کی ذہنی اپج اور قوتِ تخیل کا دخل ہے۔ اور یہی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔ ان کا قلم جوہر دکھاتا نظر آتا ہے۔ اور وہ ایک بہترین انشا پرداز کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان مضامین میں زور بیان، رنگینی اور افسانویت و ڈرامائیت خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی طرزِ تحریر سادہ اور سلیس ہے۔ لیکن تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے اس میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔

نیرنگِ خیال کے مضامین میں غیر مادی تصورات اور ان کے متعلقات کو بڑی خوبی سے مادی کرداروں کی شکل دی گئی ہے۔ مثلاً ''آرام'' کو ایک بادشاہ فرض کیا گیا۔ سچ کو ایک ملکہ خیال کر کے ''ملک صداقت زمانی'' کا نام دیا گیا اور ''دروغ دیوزاد'' کو جھوٹ کا بادشاہ تصور کیا گیا۔ آزاد نے اس طرح سے کئی کردار تراشے ہیں۔ تمام مفروضات کو استعارہ سے کام لے کر قصے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اور ان قصوں سے اخلاقی نتیجے نکالے ہیں۔ جن کے پیچھے مفید اور کارآمد نصیحتیں پوشیدہ ہیں۔ ان انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وعظ و نصیحت کے خشک مضامین کو دلچسپ قصے کہانیاں بنا دیا گیا ہے۔ یہی آزاد کی طرزِ تحریر کی خوبی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

15. محمد حسین آزاد کے انشائیوں کے مجموعہ کا کیا نام ہے؟
16. ''نیرنگ خیال'' کا پہلا حصہ کس سنہ میں شائع ہوا؟
17. ''نیرنگِ خیال'' سے پہلے کس تصنیف میں تمثیلی پیرایہ ملتا ہے؟
18. آزاد نے انگریزی کے کن مضمون نگاروں سے استفادہ کیا ہے؟

2.6 انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا متن (اقتباس)

عہد قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہسواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آ جاتی ہوگی۔

مگر کیا اچھی بات ہوتی۔ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے۔ اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آ کر ان کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا۔ تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے۔ ناچار سکڑنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔ جب لقمہ رزق پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے۔ اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ اور استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں کیونکہ خوشامد جس کی دوکان میں آج موتی برس رہے ہیں۔ اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار امید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک ہیں۔ انہیں باتوں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے۔ اس طرح جب جلسوں میں نمودئے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ (اک قسم کا شکاری کتا ہے، جسے ہندوستانی زبان میں گلڈانک کہتے ہیں) کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں۔ تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے عرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ کبھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مردار سے متنفر ہیں۔ وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شئے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت

انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی۔ اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سنتے ہیں۔ اس کان نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں۔ تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملک صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم وتربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کرلیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے۔ تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر ومنزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا۔ اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے۔ تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی۔ سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور وطاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی۔ اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی۔ اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح واقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے۔ اور پیچھے پیچھے ادراک پری پرواز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان

شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگر چہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اٹھتا تھا۔ دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سانگ بھرتا تھا۔ تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہواو ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں۔ اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا۔ اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں۔ اور کام بھی الٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتحیاب تو جلد ہو جاتا تھا۔ مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہواو ہوس اس کے یار وفادار تھے۔ اور اگر چہ کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

2.7 انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا تجزیہ

محمد حسین آزاد کا انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' 'نیرنگِ خیال' کے حصہ اول میں شامل ہے۔ یہ انشائیہ انگریزی مضمون نگار جانسن (Johnson) کے مضمون "Truth, Falsehood and Fiction, an Allegory" سے ماخوذ ہے۔ اس انشائیہ میں محمد حسین آزاد نے غیر مادی تصورات جیسے ''سچ'' اور ''جھوٹ'' کو دو بنیادی کرداروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انسانی فطرتوں میں ان دو تصورات کی آپسی کشمکش کو ایک قصہ کا روپ دیا ہے کہ کس طرح 'جھوٹ' ہمیشہ 'سچ' کو مات دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن آخر میں سچ کی ہی فتح ہوتی ہے۔

اس انشائیہ میں سچ اور جھوٹ کو جسمانی پیکر دے کر اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو تمثیلی پیرایے میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے جیسا کہ زمانے میں جھوٹ کا عمل دور تک پھیل گیا ہے اور سچ کو لوگ بہتر نہیں سمجھتے اور سچ کو ہر موقع پر استعمال نہیں کرتے۔ اس طرح سچ اور جھوٹ کے درمیان ہمیشہ رسہ کشی چلتی رہتی ہے۔ آخر کار سچ کی کوششوں سے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ملکہ صداقت زمانی بیگم جو سلطان آسمانی اور دانش خاتون کی بیٹی ہے خوبیوں اور عزت و دوام کے تاج سے مرصع ہے۔ دوسری طرف حمق تیرہ دماغ اور ماں ہوس ہوا پرست کا بیٹا دروغ دیوزاد ہے۔ یہ منافق سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا ہے۔ ملکہ صداقت زمانی کی قدر و منزلت اور خوبیاں دیکھ کر اس کے من میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور وہ ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کی سوچ لیتا ہے۔ ادھر ملکہ صداقت بھی اس سے مقابلے پر اتر آئی۔ جتنا دروغ دیوزاد حملہ کرتا ملکہ اپنے دبدبہ اور استقلال سے مقابلہ پر ڈٹی رہتی۔ مقابلے کے لیے وہ شیخی، نمود، دغا، طراری، ہوا و ہوس جیسے ساتھیوں کی مدد بھی حاصل کرتا تاہم اکثر معرکہ آرائیوں میں ملک ہی فتحیاب ہوتی۔ نتیجتاً دروغ دیوزاد نے دھوکہ بازی اور شبہ کاری کا روپ بدل کر دنیا پر حملے شروع کیے اور کئی مقامات پر کامیاب بھی ہو گیا اور دروغ شاہ و دیوزاد کا لقب اختیار کر کے دنیا پر حکومت کرنے لگا۔

ملکہ صداقت یہ سمجھتی تھی کہ بنی آدم اس کے آمد سے خوش ہوں گے اور ہر لمحہ اس کا ساتھ دیں گے لیکن جب دیکھتی کہ ہر مقام پر مکر و فریب سے سابقہ پڑتا ہے۔ مایوس ہو کر اس سلطان آسمانی کو رکھ بھیجا کہ یہاں میری ضرورت نہیں ہے مجھے واپس بلا لیں۔ تب سلطان آسمان نے عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے مشاورت کی اور وجوہات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ملکہ صداقت زمانی کی طبیعت میں دراصل سختی اور تلخی ہے۔ سچ کا سخت رویہ سب کو برا معلوم ہوتا ہے۔ اور اکثر سچ کی راست بازی کی وجہ سے لوگوں کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ جب کہ زمانہ میں دور اندیشی کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ دروغ دیوزاد چالاکی سے اپنی چالیں چل جاتا ہے۔ مصلحت کا لباس زیب تن کرتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ سلطانِ آسمان نے ملکہ کو بھی اس طرح کا مصلحتوں کا پیرہن زیب تن کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ملک نے اس حکم کی تعمیل کی۔ مصلحت کا لباس پہنے ملک ملک پہنچتی اور پھر نیا جامہ اتار پھینکتی۔ جامہ کے اترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور حسن و جمال چمک اٹھتا اور جھوٹ اپنی سیاہی کے ساتھ وہاں سے دور ہٹ جاتا۔

محمد حسین آزاد کا یہ ایک خوبصورت تمثیلی انشائیہ ہے۔ جس میں بھرپور افسانویت اور ڈرامائیت پائی جاتی ہے۔ یہ انشائیہ ایک خاص مقصد کو پیش کرتا ہے کہ جھوٹ زمانہ میں کتنی کوششیں کر لے ناکام ہی رہتا ہے۔ سچ اور جھوٹ

کی روز اول سے کش مکش ضرور رہی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ جھوٹ کو مات ہوتی ہے اور سچ غالب آجاتا ہے۔ اس طرح آزاد نے اس اخلاقی مسئلہ کو استعاروں کے سہارے اس خوبصورتی سے پیش کیا کہ یہ ایک پراثر کہانی بن گئی۔ جھوٹ کے جتنے رخ اور جہتیں ہوسکتی تھیں ان کی طرف مضمون نگار نے بڑی کامیابی کے ساتھ متوجہ کیا ہے۔ اور یہ آزاد کے قلم کا جادو ہی ہے کہ انہوں نے اس انشائیہ میں جو منظر کھینچا ہے وہ متحرک نظر آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

19. 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' انگریزی کے کس مضمون سے ماخوذ ہے؟

20. ''سچ'' کے کرداروں کا نام کیا ہے؟

21. ''جھوٹ'' کو کیا نام دیا گیا ہے؟

2.8 خلاصہ

انشائیہ اُردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ یہ دراصل مضمون کی ہی ایک قسم ہے۔ لیکن مضمون کے برخلاف اس میں عبارت کو سجا کر بات سے بات پیدا کی جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے انشائیہ لکھے۔ ان سے قبل سرسید، ماسٹر رام چندر اور مولوی ذکاء اللہ کے مضامین ملتے ہیں۔ لیکن ان کے مضامین میں وہ شگفتگی یا استعاراتی انداز نہیں ملتا جو کہ انشائیہ کے لیے ضروری ہے۔

محمد حسین آزاد اردو کے نامور انشاء پرداز ہیں۔ ان کا شمار اُردو کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اپنی شگفتہ بیانی سے اسے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ نثر میں ان کی متعدد کتابیں اُردو ادب کے شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ خاص کر ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''نیرنگ خیال'' ان کے شگفتہ اسلوب کی بہترین یادگار ہے۔ آزاد اُردو شاعری کی تاریخ میں بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ''انجمن پنجاب'' کے قیام کے بعد سے انہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ کر اُردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی اور غزل کو بھی کافی فروغ دیا۔

آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ ''نیرنگ خیال'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں آٹھ اور دوسرے حصے میں پانچ مضامین ہیں۔ آزاد نے انگریزی مضمون نگاروں ایڈیسن اور جانسن کے مضامین پڑھوا کر سنے اور اس سے استفادہ کر کے اُردو میں انشائیہ لکھے۔ ان کے انشائیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تمثیلی انداز اختیار کیا اور غیر مادی صفات اور اشیاء کو مادی پیکر عطا کر کے بڑی ہی خوبصورتی سے قصہ کے انداز میں پیش کیا۔ ان قصوں میں ڈرامائیت کی بنا پر دلچسپی قائم ہو جاتی ہے۔ ان کے انشائیے ایک خاص مقصد کے پیش نظر لکھے گئے کہ لوگ برائیوں کو سمجھیں اس سے دور رہیں اور اپنی زندگی سنوار لیں۔ بنیادی طور پر ان کے انشائیوں میں یہی اخلاقی نقطۂ نظر غالب رہا۔ ''انشائیہ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے 10-10 سطروں میں جواب دیجیے:

1. محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی قلم بند کیجیے۔
2. محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لیجیے۔
3. تمثیل یا رمزیہ (Allegory) سے کیا مراد ہے؟ بیان کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے 30-30 سطروں میں جواب دیجیے:

1. محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری پر مفصل مضمون لکھیے۔
2. محمد حسین آزاد کی حیات اور ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا خلاصہ قلم بند کیجیے اور اس انشائیہ کے مرکزی خیال کی وضاحت کیجیے۔

2.10 فرہنگ

استقلال	مستقل مزاج
راستی	مسیحائی، ایمانداری
متنفر	نفرت کرنے والا
تاجِ مرصع	جواہرات جڑا ہوا تاج
تمسخر	ہنسی۔مذاق
منافق	ریاکار، نفاق رکھنے والا
سانگ	نقل، اداکاری، بہروپ
طراری	تیزی، چالاکی
دانائی	عقل، دانش
مادی	قدرتی، طبعی، اصلی
خلعت	وہ پوشاک جو بادشاہ یا امرا کی طرف سے بطور عزت افزائی ملے
قلعی	روغن، رنگ
تفریح طبع	دل بہلاوا، دل لگی
انشاء پرداز	مضمون نگار، ادیب
شاہکار	سب سے بڑا کارنامہ
تخیل	تصور، خیال
ماخوذ	اخذ کیا گیا

2.11 معاون کتابیں

.1	اردو مضمون کا ارتقاء	ڈاکٹر سیدہ جعفر
.2	محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف	ڈاکٹر اسلم فرخی
.3	نیرنگ خیال	محمد حسین آزاد
.4	انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین

2.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

.1 1830ء

.2 اردو اخبار

.3 ابراہیم ذوق

.4 میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ

.5 شمس العلماء

.6 1910ء میں

.7 جدید شاعری

.8 قصص ہند

.9 نیرنگ خیال

.10 تاریخ ہند

.11 سیر ایران

12. آبِ حیات
13. نظمِ آزاد
14. پنڈت من پھول
15. نیرنگِ خیال
16. 1881ء
17. سب رس
18. Addison اور Johnson
19. Truth, Falsehood and Fiction, an Allogery
20. ملکہ صداقت زمانی بیگم
21. دروغ دیوزاد

اکائی 10 : عبدالحلیم شرؔر: 'دیہات کی زندگی'

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 عبدالحلیم شرؔر کے حالاتِ زندگی

3.4 عبدالحلیم شرؔر کی ادبی خدمات

3.5 عبدالحلیم شرؔر کی انشائیہ نگاری

3.6 'دیہات کی زندگی' کا متن (اقتباس)

3.7 'دیہات کی زندگی'' کا تنقیدی جائزہ

3.8 خلاصہ

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

3.10 فرہنگ

3.11 معاون کتابیں

3.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ عبدالحلیم شرؔر کے انشائیہ'' دیہات کی زندگی'' کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس میں انشائیہ کی تعریف، اس کی خصوصیات اور اس کی زبان واسلوب سے متعلق پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ زیرِ نظر اکائی کے مطالعہ سے آپ عبدالحلیم شرؔر کی حیات، ان کی ادبی خدمات، ان کی انشائیہ نگاری اور خاص طور سے ان کے انشائیہ'' دیہات

کی زندگی'' میں پیش کئے گئے خیالات اور اس کی زبان واسلوب کے بارے میں واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

3.2 تمہید

انشائیہ (Light Essay) اردو نثر کی ایک اہم صنف ہے۔ جس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی اور نہ ہی موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہی اس کی کوئی حد یا زاویہ متعین ہوتا ہے۔ انشائیے میں ہر طرح کے خیالات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مصنف اپنی تحریر کو بوجھل اور خشک نہ ہونے دے۔ بلکہ وہ زبان و بیان کی تازگی اور اسلوب کی دلکشی ورنگارنگی کے ذریعے قاری کی حس کو گدگدائے اور اسے لطف ولذت سے آشنا کرے۔

اردو کے نمائندہ انشائیہ نگاروں میں محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، ناصر دہلوی، نیاز فتح پوری، پطرس بخاری، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

3.3 عبدالحلیم شرر کے حالات زندگی

عبدالحلیم شرر کی پیدائش 10 جنوری 1860ء کو لکھنؤ کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان علمی و تعلیمی اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے والد کا نام تفضّل حسین تھا۔ شرر کے نانا منشی قمرالدین کا تعلق اودھ کے شاہی دربار سے تھا۔ جب 1856ء میں انگریزوں نے ریاست اودھ کا الحاق کرلیا اور واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے کلکتہ لے گئے تو منشی قمرالدین بھی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور ان کے ساتھ مٹیا برج میں رہنے لگے۔ بعد میں شرر کے والد تفضّل حسین بھی منشی قمرالدین کے توسط سے کلکتے میں واجد علی شاہ کے خاص ملازموں میں شامل ہوگئے۔ گرچہ شرر کو بچپن ہی میں ان کے نانا لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین کے مکتب میں داخل کرادیا تھا، جہاں سے ان کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ لیکن بعد کو ان کے والد اور نانا نے شرر کو بھی کلکتہ بلالیا۔ جہاں انھوں نے عربی اور فارسی کی باضابطہ تعلیم حاصل کی۔

عبدالحلیم شرؔر کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ کلکتے میں والد اور نانا کی نگرانی میں ان کا تعلیمی ذوق و شوق اور نکھرتا گیا۔ کلکتے میں شرؔر کو درباری ماحول اور شہزادوں کی صحبت ملی جہاں عیش وعشرت کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ اس ماحول نے شرؔر کے ذہن کو رنگین مزاجی کی طرف مائل کیا لیکن اس ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے علمی ذوق وشوق کو برقرار رکھا۔ کلکتے میں قیام کے دوران شرؔر کی دلچسپی مذہبی تعلیم میں بھی بڑھی۔ کلکتے کے ایک بزرگ عالم محمد تقی اور دیگر علماء کی صحبتوں سے انہوں نے خوب فیض حاصل کیا۔ مذہبی تعلیم کے حصول کا ذوق کلکتے سے واپس لکھنؤ آنے کے بعد بھی برقرار رہا۔ لکھنؤ میں خاص طور سے مولانا عبدالحی اور مولانا حامد حسین کی علمی لیاقت نے شرؔر کے علمی ذوق کو اور فروغ دیا۔

1879ء میں لکھنؤ کے ہی ایک علمی گھرانے میں شرؔر کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد شرؔر کچھ دنوں کے لیے دہلی چلے گئے اور وہاں بھی اپنے علم کی پیاس کو بجھانے میں مصروف رہے۔ دہلی میں ہی مولانا نذیر حسین کی شاگردی میں شرؔر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے اور پھر انہیں کے توسط سے شرؔر کی ملاقات منشی احمد علی کسمنڈوی سے ہوئی۔ منشی احمد علی کسمنڈوی نے مضمون نگاری کے سلسلے میں شرؔر کی نہ صرف تربیت کی بلکہ ان کی صلاحیت اور دلچسپی کو پروان چڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

مضمون نگاری کے شوق نے ہی شرؔر کو لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' سے وابستہ کیا، جہاں انہوں نے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ شرؔر نے اودھ اخبار میں مختلف موضوعات پر لاتعداد مضامین لکھے جس سے ان کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا ساتھ ہی ان کے ادبی جوہر کو نکھرنے کا بھی خوب خوب موقع ملا۔ اسی زمانے میں شرؔر نے مولانا عبدالباسط کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس کا نام ''محشر'' رکھا۔ لیکن دوسال بعد ''اودھ'' اخبار کے مالک منشی نول کشور نے ان کو خاص نامہ نگار بنا کر حیدرآباد بھیج دیا جس کے سبب ''محشر'' کو بند کرنا پڑا۔

''اودھ'' اخبار سے شرؔر کی ملازمت کا رشتہ کچھ عرصے بعد جب ختم ہوگیا تو شرؔر بے روزگار ہوگئے۔ لیکن جلد ہی منشی نثار حسین جو کہ رسالہ ''پیام یار'' کے مدیر تھے، ان کی تحریک پر شرؔر ناول نگاری کی طرف مائل ہوئے اور پہلا

ناول ''دلچسپ'' لکھا۔اس ناول کی مقبولیت نے ان کے حوصلے کوتقویت عطا کی۔شرؔر اس درمیان انگریزی زبان سیکھنے کی طرف بھی مائل ہوئے۔انگریزی زبان نے شرؔر کو ناول نگاری کے فن سے آگہی بخشی۔انہوں نے بنگلہ ناول ''درگیش نندنی'' کے انگریزی ترجمے کواردو میں ''زمیندار کی بیٹی'' کے نام سے منتقل کیا۔اس ناول کی اشاعت نے شرؔر کی شہرت میں اوراضافہ کیا۔اسی درمیان مولوی بشیر الدین کے مشورے اورتحریک پر شرؔر نے اپنا رسالہ ''دلگداز'' نکالنا شروع کیا۔جواپنے عہد کا ایک اہم اور معیاری ادبی رسالہ تھا۔اس رسالے کی مقبولیت نے شرؔر کی ادبی وعلمی حیثیت کو نہ صرف چار چاند لگایا بلکہ ان کی مالی حالت کو بھی مستحکم بنادیا۔''دلگداز'' کی آمدنی سے انہوں نے خود اپنا پریس بھی قائم کرلیا۔اس کے بعد شرؔر نے مڑ کر کبھی پیچھے نہیں دیکھا اور یکسوئی کے ساتھ انہوں نے یکے بعد دیگرے بڑی تعداد میں ناول، مضامین، انشایئے لکھنے کے علاوہ تاریخ اور سوانح وغیرہ پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔

شرؔر نے انگلستان کا سفر بھی کیا اور وہیں دوران قیام فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھے اوراعلی، علمی وادبی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ پختہ عصری شعور کے بھی حامل تھے۔مشرقی روایتوں اور اپنی تہذیب و ثقافت سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔اس لیے ان کی حفاظت کے لیے زندگی بھر اپنے قلم کے ذریعے کوشاں رہے۔ان کے اندر قومی جذبہ اور وطن پرستی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔انہوں نے اپنی تحریروں اور تخلیقات کے ذریعے عوام کے دلوں میں بھی قومی اور وطنی جذبے کو بھرنے کی خوب کوشش کی۔

عبدالحلیم شرؔر تقریباً چالیس سال تک ادب اور صحافت کے میدان میں سرگرم رہے۔وہ اپنے عہد کے ممتاز ادیب اور دانشور تھے۔ان کی تحریریں اور تصانیف ان کی علمیت اور لیاقت کا بین ثبوت ہیں۔اپنی عمر کی آخری منزل میں بھی شرؔر علمی وادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔وہ اردو زبان وادب کے ایک اہم سپاہی اور بے لوث خادم تھے۔اردو ادب کے دامن کو بے شمار جواہر پاروں سے مالا مال کرنے والا یہ خادم ستر برس کی عمر میں 10 جنوری 1926ء کو لکھنؤ ہی میں اس دارفانی سے رخصت ہوا۔شرؔر کی علمی وادبی خدمات کواردو زبان وادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1۔ عبدالحلیم شرؔر کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی تھی؟

2۔ شرؔر کے والد کا نام کیا تھا؟

3۔ شرؔر کے نانا منشی قمرالدین کس ریاست کے دربار سے وابستہ تھے؟

4۔ شرؔر نے شروع میں کس اخبار میں ملازمت کی تھی؟

5۔ شرؔر کے رسالے کا نام کیا تھا؟

3.4 عبدالحلیم شرؔر کی ادبی خدمات

عبدالحلیم شرؔر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز گرچہ مضمون نگاری سے کیا اور خاص طور سے اودھ اخبار میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اپنے موضوعات اور زبان و بیان کے سبب کافی مقبول ہوئے، لیکن جلد ہی انھوں نے ناول نگاری کو اپنا خاص میدان بنالیا۔ ان کا پہلا ناول ''دلچسپ'' 85-1884ء کے درمیان شائع ہوا۔ جس سے ان کی مقبولیت کا ایک نیا باب کھلا اور پھر یکے بعد دیگرے انھوں نے کئی اہم ناول تخلیق کیے۔ خاص طور سے تاریخی ناول نگاری میں کوئی بھی ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ انھوں نے ایک اہم رسالہ ''دلگداز'' بھی نکالا اور مختلف موضوعات پر مضامین اور ناول لکھنے کے علاوہ تاریخی اور سوانحی کتابیں بھی لکھیں جن میں ''تاریخ سندھ'' اور ''تاریخ عزیز مصر'' خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔

عبدالحلیم شرؔر کے ناولوں میں ''دلچسپ''، ''ملک العزیز ورجینا''، ''حسن انجلینا''، ''منصور موہنا''، ''فلورا فلورنڈا''، ''ایام عرب''، ''فردوس بریں''، ''شوقین ملکہ''، ''فتح اندلس''، ''زوال بغداد''، ''رومۃ الکبریٰ''، ''حسن کا ڈاکو''، ''خوف ناک محبت''، ''بابک خرمی''، اور ''مینا بازار'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

عبدالحلیم شرؔر کی شناخت اردو ادب میں خاص طور سے ایک تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ انہوں

نے ہی اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی اور اس کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اسی مناسبت سے انہیں اردو کا والٹر اسکاٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ''ملک العزیز ورجینا'' شرر کا پہلا تاریخی ناول ہے جس کی تخلیق انہوں نے انگریزی کے مشہور تاریخی ناول نگار والٹر اسکاٹ کے ناول ''طلسمان'' کے جواب میں کی تھی۔ اس ناول کی اشاعت سے بطور تاریخی ناول نگار شرر کا سکہ ایسا جما کہ آج تک اردو ناول نگاری پر اس سکے کی چھاپ موجود ہے۔ اس کے بعد شرر نے تاریخی ناول نگاری کو ہی اپنا خاص میدان بنالیا اور تقریباً دو درجن تاریخی ناول لکھے جنہیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

تاریخی ناولوں کے علاوہ عبدالحلیم شرر نے کئی معاشرتی ناول بھی لکھے، جن میں شرر کے اور اس معاشرے کی تہذیبی و سماجی صورت حال کی عمدہ ترجمانی ملتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ناولوں کے علاوہ مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری وغیرہ میں بھی شرر نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ انہوں نے ڈرامے اور نظم کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ خاص طور سے نظم معریٰ کے بنیاد گزاروں میں شرر کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔

شرر کا تخلیقی سفر 85-1884ء سے شروع ہوکر 1926ء تک جاری رہا۔ انھوں نے اس مدت میں بے شمار کتابیں، مضامین اور انشائیے لکھ کر اور اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔ شرر کی ان بیش بہا ادبی خدمات کی بنا پر ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

6. شرر کے پہلے ناول کا نام بتائیے۔
7. شرر کو مغرب کے کس ادیب کے مماثل کہا جاتا ہے؟

3.5 عبدالحلیم شرر کی انشائیہ نگاری

عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر ناول نگار تھے۔ انھوں نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس میدان میں انھیں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن انھوں نے انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا اور

خوب داد وصول کی۔شرر نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں مختلف مسائل اور موضوعات پر بڑی تعداد میں انشائیے لکھے جنھیں کافی پسند کیا گیا۔ان کے نمائندہ اور مقبول انشائیوں میں ''نہیں''، ''نسیم سحر''، صحبت برہم''، ''عمر رفتہ''، ''دیہات کی زندگی''، ''لالۂ خودرو''، اور ''ہم تم اور وہ'' خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کی خاص صفت فکر کی رنگا رنگی اور زبان و بیان کی تازگی ہے۔ان کے انشائیے لطیف انداز میں قاری کی فکر و احساس کو بیدار کرتے ہیں۔وہ قاری کو لطف اور جمالیاتی سرور عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حس کو بھی گدگداتے ہیں۔ان کا انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' انہی خوبیوں کا حامل ہے۔

3.6 ''دیہات کی زندگی'' کا متن (اقتباس)

اے شہروں کے عالیشان محلوں میں رہنے والو! تمھیں نہیں معلوم کہ دیہات والے دنیا سے کیا لطف اٹھاتے ہیں۔تم ایک منزل عشرت میں ہو۔عالم کی نیرنگیاں تمہاری نظر سے بہت کم گزرتی ہیں۔جس مقام پر تم ہو وہاں صبح و شام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا پورا اثر نہیں دکھا سکتیں۔خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور غروب ہوا۔ہوا کس طرف کی چلی اور کیا بہار دکھا گئی۔مگر غریب دیہات والے جنہیں تم نے اکثر ذلت کی نظر سے دیکھا ہوگا' وہ ان امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ہر صبح انہیں ایک نیا لطف دکھاتی ہے اور ہر شام سے انہیں ایک نئی راحت نصیب ہوتی ہے۔

گاؤں کے جفاکش رہنے والے صبح ہونے سے پہلے ہی نیند کا پورا مزہ اٹھا چکتے ہیں۔صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے ہیں اور وہ اپنی رات کی ضروری راحت سے اکتا چکے ہیں۔ایسے وقت میں نسیم سحر کے خوشگوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب سے انہیں جگانے لگتے ہیں۔اس وقت ان کے ناز اور باد سحر کے نیاز دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ جگاتی ہے اور وہ نہیں جاگتے صرف کروٹیں بدل بدل کر رہ جاتے ہیں۔.....صبح کے نقیب مرغان سحر اٹھتے ہیں اور انہیں اٹھاتے ہیں۔غریب محنت پسند لوگ تازہ دم اٹھ بیٹھتے

ہیں۔ وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے اور بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا پہلا کام ہوتا ہے کہ جھونپڑوں سے باہر نکلے۔ آسمان کو دیکھا جس میں تارے جھلملا رہے تھے۔ افق مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی جو رات بھر کے چمکے ہوئے تاروں پر غالب آتی جاتی تھی۔ کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا جن پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ سماں اپنی خوبیاں دکھا کر انہیں بے خود کرنے کو تھا کہ انہوں نے اپنے دن کے کام کو یاد کیا آگے بڑھے اور رات کی دبی ہوئی آگ پر گری پڑی پتیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ تاپ تاپ کے افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا۔ اس کے بعد پاس کے شکستہ جھونپڑے میں جا کے بیل کھولے اور عین اس وقت جب کہ آفتاب کی کھڑی کھڑی کرنیں مشرقی کنارہ آسمان سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں۔ یہ لوگ لمبے لمبے ہلوں کو کندھے پر رکھ کے کھیت کی طرف روانہ ہوئے۔ کھیتوں کی مینڈوں پر جا رہے ہیں اور زمین کی فیاضیوں کو کس مسرت اور خوشی کی نظر دیکھتے جاتے ہیں۔ ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے ہیں۔ نظر اس خوشگوار سبزے سے عجیب لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دور چلی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودے جو خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی لے کر آئے ہیں کس قدر شگفتہ اور بشاش نظر آتے ہیں۔ رات کا برقع اڑھا کر آسمان نے انہیں اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ کیونکہ تاروں کی چھاں میں اس وقت ان کی نازک اور چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے ہیں ایک عالم جواہر ہے جس پر جھلملاتے ہوئے تاروں کی شعاعیں خدا جانے کیا کیفیت دکھا رہی ہیں کیا ریاں کیا ہیں، کسی رات کی بے تکلفی کا صدمہ اٹھاتے ہوئے سراپا ندامت حوروش کا پسیجا ہوا چہرہ ہیں۔ جس پر سے پسینے کی طرح شبنم کے قطرے ٹپک ٹپک کر گر رہے ہیں ان جفاکشوں نے اس وسیع میدان کو نہایت شوق سے دیکھا جو اس وقت تو صرف ان کی نظر ہی کو خوش کرتا ہے مگر اصل میں قدرت کے ہدیے اور نیچر کے تحفے ہر جان دار کو اسی کی فیاضیوں سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتوں میں پہنچ کر اپنی غفلت پر نادم ہو گئے کیونکہ اور لوگ ان سے پیشتر پہنچ چکے تھے۔

یہ سب لوگ تر و تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے۔ آفتاب کی کرنوں نے جو امیر و غریب سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں کھیتوں کی مینڈوں پر اور کنووں کے کناروں پر ان کا خیر مقدم ادا کیا۔ اب یہ لوگ اپنے کام میں اس

قدر مصروف ہیں کہ نیچر کے جذبات بھی ان پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے اور قدرت کی بہار بھی ان کی دل فریبی کرنے سے عاجز ہے۔ وہ ہرا ہرا سبزہ زار۔ وہ سہانا سماں۔ وہ صبح کی بہار۔ وہ تر و تازہ ہوا۔ وہ اجلی کرنیں ایسی چیزیں ہیں جن کا شوق اکثر بے چین طبیعت والوں کو شہروں سے باہر کھینچ لے جایا کرتا ہے۔ ان کو یاد کرتے ہی بار ہا ہم پر ایسی وحشت سوار ہوئی ہے کہ گھر سے دو دو تین کوس تک نکل گئے ہیں۔ مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کاموں میں ایسے مصروف ہیں کہ ان کیفیتوں کو آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے۔ زمین کی اس استعداد بڑھانے میں دل و جان سے ساعی ہیں جو صرف ان کے لیے نہیں تمام دنیا کے لیے مفید ہے۔ جان توڑ توڑ کر محنت کر رہے ہیں غریب کم قوت بیل جو شاید رزق رسانیِ عالم کی فکر میں دبلے ہو گئے ہیں ان کے ہاتھوں کی مار کھاتے ہیں اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں اپنی محنت آسان کرنے کے لیے یہ لوگ نہایت دردناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں اور ان کی آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے۔ کنووں کے کنارے والے پانی نکال نکال کر زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ دیکھو وہ کس شوق سے اس بات کے منتظر ہیں کہ ڈول اوپر آئے اور انڈیلیں اور جس وقت ڈول ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے کس جوش کے عالم میں چلا اٹھتے ہیں ''اللہ دین'' پانی ان کی بڑی دولت ہے جس کی امید میں وہ آرزومند بن بن کر کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور کبھی کنوؤں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ آفتاب پوری بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جھکتے جھکتے افق مغرب کے قریب پہنچتے وقت باغ عالم کی دلچسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال میں زرد پڑ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آفتاب کی حالت اور وضع میں اختلاف ہو جاتے ہیں مگر یہ تھکنے والے اور دھن کے پکے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی وقت سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ نہ محنت انہیں تھکاتی ہے۔ نہ مشقت انہیں ماندہ کرتی ہیں۔ نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں۔ نہ کام سے اکتاتے ہیں۔ الغرض آفتاب غروب ہوتا ہے دن ان سے رخصت ہوتا ہے اور یہ شام کی دل فریب کیفیتوں کا لطف بخوبی دیکھ کر یہ امید لگا کے کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ تر و تازہ پائیں اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں خوش خوش اس کچے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں..... بی بی غریبی کا کھانا اور فضل کے مناسب غذا ان کے سامنے لا کے رکھ دیتی ہے اور تہ دل سے خدا کا شکر یہ

ادا کر کے کھاتے ہیں اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کر کے اپنے تئیں سویرے ہی سلا دیتے ہیں یہ وہ وقت ہے جس وقت شہروں کے پہروں چڑھے تک سونے والے سیہ کار اپنی شرمناک زندگی کے برے نمونے دکھانے کے لیے جاگتے ہوتے ہیں۔ زاہد نماز عشاء پڑھ کے سو چکا ہے بے فکرے گپیں اڑا رہے ہیں شعراء مضمون آفرینی کی فکر میں ہیں امراء کے محلوں میں کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ بچے کہانیاں سن رہے ہیں۔ طلبہ کتاب پر جھکے ہوئے ہیں۔ مے کش وہ پیاس بجھا رہے ہیں جو کمبخت نہیں بجھتی۔ سیہ کار بدکاری کی دھن میں شہر کی سڑکیں اور گلیاں چھان رہا ہے اور یہ جفاکش عجب میٹھی نیند میں غافل سو گئے ہیں تا کہ تڑکے آنکھ کھلے۔ یہ بچھلا اطمینان اور یہ سچی آسائش بے شک حسد کے قابل ہے۔

دیہات کی کنواری لڑکی اپنے خیالات اور اپنے ارادوں اور اپنے حرکات وسکنات غرض ہر حیثیت سے پاک دامن اور باعفت ہے۔ اس کا حسن اس کی سادگی ہے اس کی خوبیاں اس کے کام کاج ہیں۔ صبح کو اٹھتے ہی وہ دھان کوٹنا شروع کرتی ہے اور گھر بھر کی ضرورت کے موافق چاول تیار کر لیتی ہیں۔ گیہوں پچھوڑ کر آٹا پیستی ہے اور بڑی شگفتگی اور خوشی کے ساتھ ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے اور اسے اس امر کا موقع روز دیتی ہے کہ گھر کے آدمیوں کے لیے کھانا پکائے قدرت کا قیمتی اور سادہ ہدیہ یعنی دودھ دہی معمولاً اسے بہ افراط ملا کرتا ہے۔ اسے وہ بڑی مسرت کے ساتھ خدا کا شکریہ ادا کر کے اپنی غذا میں شریک کرتی ہے ہماری طرح اس دولت میں وہ خودغرضی نہیں کرتی بلکہ پڑوس والوں کو بھی اس میں شریک کرتی ہے یہ کام اسے اتنی بھی فرصت نہیں دیتے کہ اپنے حسن کی قدر کرے۔ خدا نے اسے جیسا حسن دیا ہے اس کو ویسا ہی باقی رکھتی ہے نہ دنیاوی تکلفاف کی اسے خبر ہے اور نہ ان کو پسند کرتی ہے۔ کبھی کبھی سادہ اور بھدا زیور اس کے حسن کے بڑھانے میں کام آجاتا ہے۔ مگر شہر کی وضع دار اور حسن فروش لڑکیوں کی طرح اس پر وہ کچھ غرور اور ناز نہیں کرتی۔ اس کی نظر میں ہاتھ پاؤں اس کے حسن عالم فریب سے زیادہ قیمتی ہیں۔ وہ جانتی ہی نہیں کہ ادا کیا چیز ہے اور غمزہ کسے کہتے ہیں اسے خبر نہیں کہ اس کے حسن کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔ اور اس سے کیونکر کام لے۔ اسی سبب سے وہ اپنے باپ کی خادمہ ہے۔ اپنی ماں کی فرماں بردار ہے۔ اپنے بھائیوں کی مطیع ہے اور ایک روز اپنے شوہر کی لونڈی ہوجائے گی۔ بے عصمتی کی اسے ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ شہر سے سیہ کار بدمعاشوں کی نظر سے اس کا پیارا خوبصورت چہرہ

چھپا ہوا ہے۔ بری نظر سے دیکھنے والوں کے جال میں وہ نہ پھنسی ہے اور نہ پھنسے گی۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ شہر کی لڑکیاں کیوں بدمعاشوں کے پھندے میں پھنس جایا کرتی ہیں۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی رات کو سویرے ہی سو رہتی ہے۔ اس کے گھر میں مغلانی یا اس قسم کے ساتھ کی لڑکیاں بھی نہیں جن کی زبانی پیال پر لیٹ کے سوتے وقت وہ بدکاری کا جوش پیدا کرنیوالی حسن وعشق کی کہانیاں سنا کرے۔ وہ اپنی محنت کی داستان اپنے دل سے کہتی ہے اور آپ ہی سنتی ہے۔ چونکہ کل کے کاموں کا خیال آ جاتا ہے اس لیے لیٹتے ہی سو جاتی ہے۔ اس کے پیارے نازک خوبصورت اور دنیا بھر سے زیادہ بھولے چہرے کی شگفتگی اور افسردگی فصل کی عمدگی اور خرابی پر منحصر ہے۔ فضول میلے اسے خوش نہیں کر سکتے ناچ رنگ میں اس کا دل نہیں لگتا۔ گانا نہ خود جانتی ہے اور نہ کچھ اس کا ذوق ہے بلکہ اس کو اور اس کے گھر کو اس روز پوری خوشی ہے جس روز نیا غلہ اور نئی فصل کا تحفہ پرانے مٹی کے برتنوں میں اس کے سامنے لا کے رکھا جائے۔

3.7 ''دیہات کی زندگی'' کا تنقیدی جائزہ

انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' میں عبدالحلیم شرؔر نے دیہات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ دیہات کی زندگی سادگی، صداقت اور فطری پن سے عبارت ہوتی ہے۔ شہر کی زندگی کے برعکس دیہات میں لوگ فطرت سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ صبح ہو یا شام اور دن ہو یا رات، چاندنی ہو یا دھوپ، برسات ہو یا جاڑا، ان کا اصل مزہ اور اصل لطف دیہات کے لوگ ہی اٹھاتے ہیں۔

شرؔر نے دیہات کے لوگوں کی طرز زندگی اور فطرت سے ان کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ قدرت کا سچا جلوہ گاہ تو گاؤں ہی ہوتا ہے کیوں کہ وہاں ہر طرف قدرت کا حسن اور اس کے مناظر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے لوگوں کے برخلاف گاؤں میں رہنے والے محنت کش لوگ صبح سویرے اٹھ کر قدرت کے ان مناظر اور نعمتوں کا بھرپور مزہ لیتے ہیں۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا بڑے ناز و انداز سے انہیں اٹھاتی ہے، رات کے آخری پہر میں جھلملاتے تاروں کا منظر چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پھر سورج نکلنے کا سماں، ان سب نظاروں اور نعمتوں کے ساتھ دیہات کے لوگوں کے دن کی شروعات ہوتی ہے۔ ان نظاروں کا لطف اٹھاتے ہوئے کسان اپنے ہل بیل

لے کر تڑکے اپنے کھیتوں پر پہنچ جاتے ہیں۔صبح صبح پودوں میں لہلہاتے ہوئے پودوں کا منظر بڑا سہانا ہوتا ہے۔ان پودوں کی نازک پتیوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ ہرے بھرے کھیت، صبح کی تازہ ہوا، سورج کی کرنیں، یہ سارے مناظر ان کسانوں کے لیے عام باتیں ہیں۔وہ ان سے بے گانہ ہو کر اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ دیہات کے کسان اپنی محنت سے زمین کو پیداوار کے لائق بناتے ہیں۔وہ صبح سے شام تک جی توڑ محنت کرتے ہیں اور محنت کرتے وقت اکثر گانے گا کر ماحول کو اور خوشنما بنا دیتے ہیں۔کنوئیں سے پانی نکال کر وہ اپنے کھیتوں کی سینچائی کرتے ہیں۔ پانی چاہے آسمان سے برسے والا پانی ہو یا پھر کنوئیں سے نکالا جائے پانی ان کے لیے یہ بہت بڑی ضرورت اور دولت ہوتا ہے۔کیونکہ کسان کی ساری محنت کا اور اس کی اچھی فصلوں کا انحصار پانی پر ہی ہوتا ہے۔

دن بھر کھیتوں میں کام کرنے والے یہ کسان کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتے۔وہ ایک ہی دھن میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں۔شام کو گھر آ کر انہیں جو کچھ بھی میسر ہوتا ہے اسے کھا لیتے ہیں اور خود کو فضول کے کسی کاموں میں الجھانے کے بجائے رات کو جلد ہی سو جاتے ہیں تا کہ کل پھر تازہ دم ہو کر صبح سویرے اپنے کام پر جا سکیں۔دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو وہ جس میٹھی نیند کا مزہ لیتے ہیں وہ شہر والوں کو کہاں میسر۔

عبدالحلیم شرؔر نے اس انشائیے میں دیہات کی لڑکیوں اور کنواریوں کی خوبیوں کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔انہوں نے یہ بتایا ہے کہ دیہات گاؤں کی لڑکیاں بہت سادگی پسند، پاک دامن اور معصوم طبیعت کی ہوتی ہیں۔ ان کا ذہن گندے خیالات سے پاک ہوتا ہے۔صبح سویرے اٹھ کر وہ بھی اپنے کام کاج میں لگ جاتی ہیں۔گھر کے لوگوں کے لیے کھانا بنانے اور دوسرے کاموں میں اپنی ماں کی مدد کرتی ہیں۔وہ شہر کی لڑکیوں کی طرح بناؤ سنگار، ناز و ادا اور دوسرے فضول کے شوق سے بے نیاز ہوتی ہیں۔وہ تو اپنے ماں باپ اور شوہر کی فرماں برداری اور خدمت کو ہی اپنا قیمتی زیور اور حسن تصور کرتی ہیں۔گمراہ کرنے والے قصے، کہانیوں اور اوباش و بدمعاش لڑکوں کے جھانسوں سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتا۔انہیں میلے ٹھیلے اور ناچ، گانوں کا شوق بھی نہیں ہوتا۔ان کی خوشیاں تو ان کی محنت اور بہتر پیداوار سے جڑی ہوتی ہیں۔

شرر نے دیہات کے چودھری کی صفت بیان کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دیہات کا چودھری اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے گاؤں کے سبھی لوگ اس کے حکم اور اس کے فیصلے کی تعمیل کرتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے گاؤں والوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا ہے۔ وہ ان کو خود سے کمتر نہیں سمجھتا۔ اس کا رہن سہن اور طور طریقہ بھی گاؤں کے عام لوگوں کی طرح ہی ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کی عزت اس کی اپنی عزت ہوتی ہے۔ اس کی دولت اور ملکیت، اس کے کھیتوں کے اناج اور اس کے مویشی ہوتے ہیں۔

غرض کہ شرر نے اس انشائیے میں دیہات کے لوگوں کی زندگی اور ان کی خصوصیات کا تفصیل سے بیان کرتے ہوئے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دیہات کے لوگ سیدھے سادے محنتی، اور جفاکش ہوتے ہیں۔ وفاداری، ایمانداری، سچائی، محبت اور اتحاد ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ شہر کی بناوٹی زندگی اور ان کی ہوس اور سیہ کاری کے مقابلے، دیہات کے لوگوں کی زندگی امن وچین، قناعت اور کفایت شعاری جیسی خوبیوں کی حامل ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اپنے کھیتوں اور مویشیوں سے انھیں بے پناہ لگاؤ ہوتا ہے۔ اپنی محنت، مشقت سے وہ کھیتوں کو ہرا بھرا بناتے ہیں۔ ان میں لہلہاتی فصلیں ان کی دولت ہوتی ہیں۔ اسی دولت سے وہ اپنا اور شہر والوں کا بھی پیٹ بھرتے ہیں۔ پورے ملک اور قوم کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے وہ سال بھر جی توڑ محنت کرتے ہیں۔ وہ انسانیت کے اصل ہمدرد اور محسن ہیں۔

لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم دیہات کے ان محنت کش کسانوں سے سبق حاصل کریں، ان کی پیروی کریں اور قومی ہمدردی کا زبانی دم بھرنے کی بجائے اپنی نئی نسل کی صحیح تربیت کریں۔ اس کی ترقی وخوش حالی کے لیے موافق فضا تیار کریں ورنہ مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

اس انشائیے میں عبدالحلیم شرر نے ایک سنجیدہ موضوع کو بڑے ہی دلنشیں انداز میں پیش کر کے قاری کو لطف اور آگہی دونوں سے آشنا کیا ہے۔ زبان و بیان کی تازگی اس انشائیے کی لطافت میں اضافہ کرتی ہے۔ اسلوب میں شامل چاشنی اور خیال کی نیرنگی قاری کے احساس کو گدگدانے کے ساتھ ساتھ اسے دیہات کی زندگی کا بھرپور سیر کراتی

ہے اور اس کے علم و آگہی میں اضافہ کرتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

8. شرؔر کی نگاہ میں دیہات کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟

9. دیہات کے چودھری کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

3.8 خلاصہ

عبدالحلیم شرؔر کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بطور ناول نگار کافی شہرت حاصل کی۔ خاص طور سے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت شرؔر نے ہی ڈالی تھی لیکن انشائیہ نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں انشائیے لکھے جو اپنے دلکش انداز بیان کے سبب کافی مقبول ہوئے۔

''دیہات کی زندگی'' شرؔر کا ایک نمائندہ انشائیہ ہے۔ اس انشائیے میں انھوں نے دیہات کے ماحول، وہاں کے فطری مناظر، دیہات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، کسانوں کی طرز زندگی، ان کے حالات، ان کی محنت و مشقت اور سادگی و سچائی اور خلوص و اتحاد کو بڑے ہی دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔

''دیہات کی زندگی'' کا موضوع گرچہ سنجیدہ فکر کا حامل موضوع ہے لیکن عبدالحلیم شرؔر نے اس موضوع کو اپنے اسلوب اور انداز بیان کے ذریعے دلچسپ اور سُبک بنا دیا ہے۔ جس کو پڑھتے وقت ذہن بوجھل نہیں ہوتا بلکہ زبان کی لطافت اور چاشنی قاری کو لطف و لذت عطا کرتی ہے۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. عبدالحلیم شرؔر کا تعارف پیش کیجیے۔

2. شرؔر کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

3. دیہات کی زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **30-30** سطروں میں دیجیے:

1. انشائیہ کسے کہتے ہیں؟ شرر کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. ''دیہات کی زندگی'' میں شرر نے دیہات میں رہنے والے لوگوں کی کن خصوصیات کا ذکر کیا ہے؟
3. شرر نے گاؤں کو قدرت کا سچا جلوہ گاہ کیوں کہا ہے اور شرر نے دیہاتیوں سے کیا سبق لینے کی تلقین کی ہے؟

3.10 فرہنگ

عشرت	عیش، خوشی
نیرنگیاں	حسن، خوبصورتی
جفاکش	محنت کرنے والا، تکلیف اٹھانے والا
بادسحر/نسیم سحر	صبح کی ٹھنڈی ہوا، ہلکی ہلکی ہوا
نقیب	خبر دینے والا، آواز لگانے والا
مرغان سحر	بانگ دے کر صبح کی آمد کی خبر دینے والے مرغ
مینڈ	کھیت کی باڑ، کنارا
بشاش	ہنس مکھ، خوش
شعاعیں	کرنیں
باعفت	عزت والا، والی، پارسا
حوروش	خوبصورت، حوروں جیسا چہرے والی
ہدیہ	تحفہ، نذر

بہ افراط	کثرت سے
تکلفات	نمائش، ظاہر داری
وضع دار	اپنے طور طریقوں پر قائم رہنے والا، بانکا
حسن عالم فریب	دنیا کو دھوکے میں ڈالنے والی خوب صورتی، نمائش
مطیع	فرماں بردار، اطاعت کرنے والا
مغلانی	محل سرا میں رہنے والی خادمہ، ملازمہ
جلوہ گاہ	جلوہ دکھانے کی جگہ، دیدار کرانے کی جگہ
چابک دست	ہنر مند، دستکار
صناعی	کاریگری، ہنر مندی
پیال	دھان کا سوکھا ڈنٹھل
رفع	نکالنا، مکمل کرنا، دور کرنا
جاں فزا	خوشی بخشنے والا، فرحت بخش
کفایت شعاری	کم خرچ، واجبی خرچ

3.11 معاون کتابیں

1. عبدالحلیم شرر — ڈاکٹر شریف احمد
2. عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار — ڈاکٹر علی احمد فاطمی
3. انشائیہ اور انشائیہ نگاری — ڈاکٹر سید محمد حسنین
4. انشائیہ کی بنیاد — ڈاکٹر سلیم اختر

3.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. عبدالحلیم شرؔر کی پیدائش 10 جنوری 1860ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔
2. شرؔر کے والد کا نام تفضّل حسین تھا۔
3. شرؔر کے نانا منشی قمرالدین ریاست اودھ کے دربار سے وابستہ تھے۔
4. شرؔر نے شروع میں ''اودھ اخبار'' میں ملازمت کی تھی۔
5. شرؔر کے رسالے کا نام ''دلگداز'' تھا۔
6. شرؔر کے پہلے ناول کا نام ''دلچسپ'' تھا۔
7. والٹر اسکاٹ
8. سادگی پسند، پاک دامن اور معصوم طبیعت
9. علاقے کے بادشاہ جیسی

بلاک نمبر-4

مضمون

اکائی ۱۱۔سرسید احمد خاں: عورتوں کے حقوق

اکائی ۱۲۔شبلی نعمانی: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر

اکائی ۱۳۔عبدالحق: حالؔی

یہ بلاک درج بالا تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ بلاک اردو مضمون نگاری اور خاکہ نگاری سے متعلق ہے۔پہلی دو اکائیوں میں دو اہم مضمون نگاروں سرسید احمد خاں اور شبلی نعمانی کی مضمون نگاری پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور ان کے مضامین بالترتیب ''عورتوں کے حقوق'' اور ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔بلاک کی تیسری اکائی خاکہ نگاری کے تعلق سے ہے جس میں خاکہ نگار مولوی عبدالحق اور ان کے تحریر کردہ خاکہ ''حالؔی'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔امید ہے کہ آپ ان اکائیوں کے مطالعے سے اردو مضمون نگاری اور خاکہ نگاری کے بارے میں قدرے تفصیل سے اپنی معلومات میں اضافہ کرسکیں گے اور ساتھ ہی آپ اکائی نویس کی رائے سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

اکائی 11: سرسید احمد خاں: ''عورتوں کے حقوق''

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 مضمون کی تعریف

4.4 مضمون کے اہم اجزا

4.4.1 عنوان 4.4.2 تمہید

4.4.3 وضاحت 4.4.4 تجزیہ واستدلال

4.4.5 جامعیت 4.4.6 اخذ نتائج یا خاتمہ

4.5 مضامین کے اقسام

4.6 اردو میں مضمون نگاری کی روایت

4.7 سرسید کا سوانحی خاکہ

4.8 سرسید کی اہم تصانیف

4.9 ''عورتوں کے حقوق'' کا متن (اقتباس)

4.10 عورتوں کے حقوق کی تلخیص

4.11 ''عورتوں کے حقوق'' کے اہم نکات

4.12 خلاصہ

4.13 نمونہ امتحانی سوالات

4.14 فرہنگ

4.15 معاون کتابیں

4.16 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ ''مضمون نگاری'' سے متعلق بنیادی باتوں کی واقفیت حاصل کریں گے۔اس کے ساتھ ہی آپ سرسید احمد خاں کے علمی و ادبی کارناموں خصوصاً اصلاحی نوعیت کے مضامین کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کریں گے۔عورت سے متعلق سرسید کے خیالات کیا تھے اور مسلم معاشرے سے وہ کس طرح کی توقع رکھتے تھے؟ اس کے بارے میں بھی آپ جانیں گے۔اس اکائی کا مقصد آپ کو سرسید کی اصلاحی کوششوں اور خدمات سے واقف بھی کرانا ہے۔

4.2 تمہید

اردو کی نثری اصناف میں مضمون نگاری بھی ایک اہم اور مقبول عام صنف ادب ہے۔جس طرح صنف شاعری میں غزل کو مقبولیت حاصل ہے ٹھیک اسی طرح علمی نثر میں سب سے زیادہ مقبول صنف مضمون نگاری یا مقالہ نگاری ہے۔ایک عالم اور ایک عام آدمی ہر ایک کی دلچسپی اس صنف میں ہے۔جیسے ہر شاعر اپنی شاعری کی شروعات غزل سے کرتا ہے ٹھیک اسی طرح ہر اہل قلم اپنی بات کہنے کے لیے اسی صنف کا سہارا لیتا ہے۔آج اخبار ورسائل میں افسانہ کے بعد سب سے زیادہ مضامین ہی شائع ہوتے ہیں۔آج اخبار ورسائل کی پہچان اسی سے ہے۔بہتر مضامین ہی اخبار ورسائل کی مقبولیت کے ضامن ہیں۔اگر مضمون کا معیار اعلیٰ ہے تو رسالہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے ورنہ اسے بند کرنا پڑتا ہے۔علمی اور ادبی سمیناروں اور مذاکروں کی وقعت وکشش محض مضامین ومقالات کی وجہ سے ہے اور آج آپ اسی سے متعلق واقفیت حاصل کریں گے۔ساتھ میں اس کی تعریف، مضمون کے اقسام اور اردو میں مضمون نگاری کی روایت کیا رہی ہے، اس کے بارے میں بھی جانیں گے اور ساتھ میں سرسید کی حیات اور خدمات سے بھی آگاہی حاصل کریں گے۔

4.3 مضمون کی تعریف

لفظ مضمون کو اردو میں مقالہ بھی کہتے ہیں۔مضمون فارسی کا لفظ ہے اور مقالہ عربی لفظ ہے۔لفظ مضمون

انگریزی لفظ Essay کا ہم معنی ہے اور لفظ Essay فرانسیسی زبان کے لفظ Essai سے بنا ہے۔ Essay کا لغوی مفہوم ''کوشش'' ہے۔ یعنی ایک رسمی سی کوشش۔ اصطلاح میں Essay کو مضمون یا مقالہ (ہندی میں نی بندھ) بھی کہا جاتا ہے اور اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"A piece of writing on a particular subject"

یعنی کسی مخصوص موضوع پر تحریر کی جانے والی باتیں مضمون کے زمرے میں آتی ہیں۔ مضمون اور مقالہ کو عام طور سے ہم معنی خیال کیا جاتا ہے لیکن دونوں میں تھوڑا یا باریک سا فرق بھی ہے۔ مضمون کسی موضوع پر عام طور سے ایک سرسری وضاحتی بات ہوتی ہے۔ لیکن مقالہ میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ یہاں بھی بات وضاحت سے بیان کی جاتی ہے لیکن اس کا انداز استدلالی اور منطقی ہوتا ہے۔ ایک مضمون کا معیار جیسے ہی بلند ہوتا ہے اور اس میں حقائق وشواہد کو مربوط، منطقی اور استدلالی انداز میں تحریر کیا جاتا ہے تو وہ مقالہ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک مضمون ہلکا پھلکا اور عامیانہ انداز کا ہوسکتا ہے اور ہوتا بھی ہے لیکن ایک مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی اور اگر ایسا ہوتا ہے تو وہ مقالہ نہ رہ کر مضمون کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک مقالہ میں محض تعریف اور صرف وضاحت سے بات نہیں بنتی بلکہ اس میں مقالہ نگار اعلیٰ تنقید وتحقیق کو ہی پیش نگاہ رکھتا ہے۔ وہ معلومات کو یکجا ہی نہیں کرتا بلکہ اسے تجزیاتی انداز میں پیش بھی کرتا ہے۔

کسی مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ معروضی (Objective) ہو۔ موضوعی (Subjective) نہ ہو۔ مضمون اگر موضوعی نوعیت کا ہوگا تو وہ محض تاثراتی ہو کر رہ جائے گا یا اس کی حیثیت محض وضاحتی تحریر کی ہوگی۔ اس میں تعقل، تجزیہ اور توازن کا گذر مشکل سے ہوگا اور مقالہ نگار موضوع سے متعلق غیر جاندار نہیں رہ سکے گا اور وہ خوبیوں کو ہی زیادہ نمایاں کرے گا۔ خامیوں پر اس کی نظر نہیں جائے گی یا وہ اسے نظر انداز کرے گا یا پھر اس کا ذکر سرسری کرے گا اور اگر اسے کسی طرح کی شکایت یا اختلاف ہوگا تو وہ پھر خوبیوں کو نظر انداز کر کے خامیوں کو ہی نمایاں کرے گا اور معمولی خامی کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا اور دونوں صورتوں میں اس کا مطالعہ موضوعی (Subjective) ہوگا۔

اردو میں عام طور سے مضمون لکھنے کا ہی رواج ہے جس میں محض تاثرات تک ہی بات محدود ہوتی ہے۔ تجزیہ

اور استدلال کی صورت اکثر و بیشتر اردو مضامین میں نظر نہیں آتی۔ اور اس کی وجہ عموماً مطالعہ کی کمی، تساہل پسندی اور غیر سائنسی ذہن کا ہونا ہے۔ مخصوص صنف علم اور موضوع پر ناکافی واقفیت کا ہونا ہے۔ جب کہ سرسید اور ان کے رفقا نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اردو داں حضرات اس سے باہر نکلیں، مغربی و مشرقی معیارِ نقد کو ملحوظ رکھیں، جذباتیت اور عدم استدلال کے مقابلے تعقل پسندی سے کام لیں اور تجزیاتی انداز اختیار کریں۔ سرسید کا مضمون ''عورتوں کے حقوق'' اسی سلسلے کی ایک ابتدائی اور عمدہ مثال ہے۔ آگے چل کر ہم اس پر تفصیلی بات چیت کریں گے۔

4.4 مضمون کے اہم اجزا

مضمون کے اہم اجزا حسب ذیل ہیں:

(1) عنوان (2) تمہید (3) وضاحت

(4) تجزیہ و استدلال (5) جامعیت (6) اخذ نتائج یا خاتمہ

4.4.1 عنوان

مضمون یا مقالے کا یہ ایک اہم عنصر یا جز ہے۔ جس طرح کوئی نظم بغیر عنوان کے نہیں ہوتی ٹھیک اسی طرح بغیر عنوان کے کوئی مضمون یا مقالہ نہیں ہوتا۔ عنوان ہی اصل میں مضمون کی کنجی ہوتا ہے۔ جس سے آگے ہونے والی بحث کے بارے میں ہم اشارہ پاتے ہیں اور ہمارا ذہن عنوان کو دیکھ کر ہی اس کی تفصیلات جاننے کے لیے مائل ہوتا ہے۔ عنوان دراصل کسی بھی بحث یا گفتگو یا تحقیقی و تنقیدی بیان یا تحریر کے لیے واضح اشارہ، علامت یا مائل اسٹون (Milestone) کا کام کرتا ہے۔

4.4.2 تمہید

یہ دراصل کسی مضمون یا مقالہ کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے۔ عنوان سے متعلق اصل بحث کا آغاز کرنے سے قبل مضمون نگار مضمون کی مطابقت اور مناسبت سے اپنی بات پرزور انداز میں شروع کرتا ہے اور آگے کی بحث کا ایک اجمالی یا مختصر خاکہ پیش کرتا ہے تاکہ قاری و سامع (سننے والا) فوراً متوجہ ہو جائے اور اس کے اندر مزید جاننے کی

خواہش پیدا ہو۔ اسی لیے کسی بھی مضمون یا مقالہ کا ابتدائی حصہ انتہائی عالمانہ اور زوردار ہوتا ہے اور اسے ہونا چاہیے ٹھیک اسی طرح جس طرح قصیدے میں تشبیب کے اشعار ہوتے ہیں۔

4.4.3 وضاحت

تمہید کے بعد مضمون نگار اصل موضوع یا عنوان کے تمام اہم عناصر یا اجزا یا اہم پہلوؤں کو بتدریج یا بالترتیب قلم بند کرتا ہے۔ ممکنہ حد تک اصل موضوع کی وضاحت پیش کرتا ہے۔ موضوع سے متعلق منفی و مثبت باتوں پر مختلف زاویے سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس موضوع پر مختلف اصحابِ قلم اور اصحابِ فکر کی آرا سے روشناس کراتا ہے اور پھر اپنی بات یا رائے بھی پیش کرتا ہے تاکہ موضوع سے انصاف ہو سکے اور موضوع سے متعلق تمام حقائق و شواہد سامنے آسکیں۔

4.4.4 تجزیہ و استدلال

کسی بھی مضمون کو لکھتے وقت مضمون نگار کا انداز تجزیاتی (Analitical) ہونا چاہیے یا ہوتا ہے۔ موضوع کی مناسبت اور صنف و فن کے تقاضے کے پیش نظر وہ عنوان کا احاطہ کرتا ہے۔ تمام تر حقائق و شواہد اور اصول و ضوابط کی روشنی میں وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہے اور اسے معروضی (Objective) انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ کسی بھی مضمون کا یہ ایک اہم جز ہے اس کے بغیر مضمون یا مقالہ کا تصور محال ہے۔ خصوصاً بہتر مضمون کا خیال عبث ہے۔ یہی کسی بھی مضمون کی جان ہے۔ کسی بھی مضمون کی تحریر کے وقت مضمون نگار کا انداز تحریر منطقی اور استدلالی ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی بات مضمون نگار ہوا میں نہیں کر سکتا' اس کی بات محض خیالی نہیں ہو سکتی۔ محض مفروضے سے وہ کام نہیں لے سکتا بلکہ اسے اپنی بات دلائل کی روشنی میں کرنی ہوگی۔ اس کا انداز بیان منطقی اور طرزِ تحریر اگر استدلالی ہوگا تب ہی اس کی بات قابل قدر اور اس کی بحث قابل مطالعہ ہوگی اور ایسا نہیں ہے تو پھر اس مضمون کی اہمیت و افادیت خود بخود کم ہو جائے گی۔ بغیر کسی دلیل اور عقلی جواز کے کوئی بات تو کی جا سکتی ہے اور اس کے بغیر محض خیالی باتوں کی مدد سے کوئی مضمون لکھا تو جا سکتا ہے' لیکن ایسی صورت میں وہ مضمون سطحی قرار پائے گا اسے علمی یا معیاری مضمون نہیں کہا جا سکتا۔ یہ استدلالی انداز اسی وقت پیدا ہوگا جب عنوان سے متعلق تمام جانکاری دستیاب ہو' مضمون نگار کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ

اسے اچھی طرح سمیٹنے پر قدرت بھی رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ وہ ضروری اور غیر ضروری باتوں میں فرق کرنا جانتا ہو۔ واقعات وحقائق وشواہد کی کھتونی یا اس کا مجموعہ مضمون کہے جانے کا مستحق قرار نہیں پا سکتا' لہٰذا اس بات کا خیال مضمون نگار کو رکھنا انتہائی لازمی ہے اگر یہ باتیں ہوں گی تو مضمون کے مطالعہ سے فہم وادراک میں اضافہ ہوگا' گتھیاں سلجھیں گی' حقیقت پورے طور پر واضح ہوگی' علم کا نور پھیلے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمارا ذہن اور پریشان ہوگا اور الجھن میں مبتلا ہوگا اور ایک اچھے مضمون کی یہ شان اور پہچان نہیں ہے۔

4.4.5 جامعیت

ایک اچھے مضمون کی خوبی اس کی جامعیت بھی ہے۔ عنوان سے متعلق تمام تر باتیں جو ممکنہ حد تک ہو سکتی ہیں اسے ایک اچھا مضمون نگار ترتیب وار جمع کر دیتا ہے تا کہ موضوع سے متعلق کوئی تشنگی باقی نہ رہے اور قاری کو اس مضمون کو پڑھ کر اس موضوع/ عنوان سے متعلق عام نکات' باریکیاں اور منفی ومثبت پہلوؤں سے آگاہی ہو جائے۔ ایک بہتر مضمون کے لیے اس کا جامع ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایک اچھے اور معیاری مضمون کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

4.4.6 اخذ نتائج یا خاتمہ

کسی بھی مضمون یا مقالہ کا یہ آخری حصہ ہوتا ہے۔ جس طرح تمہید زوردار ہونی چاہیے ٹھیک اسی طرح خاتمہ بھی موثر' دلچسپ' نتیجہ خیز اور اطمینان بخش ہونا چاہیے تا کہ قاری کو یہ لگے کہ اس نے جس عنوان کے تحت مضمون پڑھا ہے وہ صحیح اور منطقی نتیجہ تک پہنچا ہے۔ اس طرح مضمون نگار کو اپنے مطالعہ کا نچوڑ اس کے خاتمے والے آخری پیراگراف میں پیش کر دینا چاہیے یا وہ پیش کرتا ہے۔ کسی بھی مضمون اور مضمون نگار کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اسی آخری پیراگراف پر ہوتا ہے۔

4.5 مضامین کے اقسام

مضامین کے مواد اور موضوعات کے اعتبار سے اُن کی زمرہ بندی کی جاتی ہے۔ کسی مضمون میں جس طرح کا مواد ہوتا ہے اُسے اُسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مضمون کو حسب ذیل قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) علمی وسائنسی (2) ادبی (3) سماجی وعمرانی (4) سیاسی

(5) فلسفیانہ (6) تاریخی (7) مذہبی واخلاقی (8) تہذیبی وثقافتی

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. مضمون کس زبان کا لفظ ہے؟
2. مضمون کو انگریزی اور ہندی میں کیا کہتے ہیں؟
3. مضمون کے اہم اجزا کی نشاندہی کیجیے۔
4. مضامین کے چند اقسام بتایئے۔

4.6 اُردو میں مضمون نگاری کی روایت

اُردو میں اس صنف کی شروعات انگریزی ادب کے زیر اثر ہوئی اور اس کا زمانہ 18 ویں صدی کے اواخر اور 19 ویں صدی کے اوائل کا ہے۔ اس صنف کی ترویج واشاعت میں ادارہ جاتی سطح پر دلی کالج (جسے 1825ء میں انگریزوں نے دلی میں قائم کیا تھا اور جو مدرسہ غازی الدین حیدر کی پرانی عمارت میں واقع تھا) کے اساتذہ اور شاگردوں کا اہم رول رہا۔ ''قرآن السعدین'' اور ''حب وطن'' کے شماروں میں انگریزی کے Essay کے طرز پر شروع میں عصری مسائل ومباحث سے متعلق مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین عام طور سے علمی وادبی، مذہبی واخلاقی اور تہذیبی وثقافتی نوعیت کے تھے۔ مذکورہ بالا مضامین کی تحریر واشاعت کا مقصد سماج میں پھیلی ہوئی جہالت اور برائیوں کو دور کرنا تھا اور غلط قسم کے رسم ورواج سے معاشرے کو نکالنا تھا۔ اسی کام کو سرسید اور ان کے رفقا، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک اور چراغ الملک نے آگے بڑھایا اور اپنے اخبار ورسائل کے ذریعے ایک تحریک کی شکل دے دی اور آج یہ صنف اردو میں سب سے زیادہ مقبول اور ترقی کی راہ پر ہے۔

4.7 سرسید کی سوانحی خاکہ

سرسید 17 اکتوبر 1817ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور 28 مارچ 1898ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا۔ ان

کے آباء واجداد ایران سے آئے تھے۔ مغلیہ عہد میں یہ اہم عہدوں پر فائز رہے۔ سرسید نے تعلیم گھر پر رہ کر حاصل کی لیکن خاندانی روایت کے باوجود انہوں نے مغلوں کی نوکری نہیں کی بلکہ انہوں نے 1841ء میں انگریزی عملداری میں مین پوری سے نوکری کا آغاز کیا اور فتح پور سیکری، دہلی، بجنور، مرادآباد، غازی پور اور علی گڑھ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ 1867ء میں بحیثیت جج بنارس میں ان کا تقرر ہوا اور وہیں سے 1876ء میں سبکدوش ہوئے۔ بنارس کے قیام کے زمانے میں ہی سرسید نے انگلستان کا سفر کیا۔ بڑے تعلیمی اداروں (آکسفورڈ، کیمبرج) کو قریب سے دیکھا اور ''خطبات احمدیہ'' جیسی کتاب لکھی۔

4.8 سرسید کی اہم تصانیف

آثار الصنادید، اسباب بغاوت ہند، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام (اس کتاب میں اسلام اور عیسائیت مذہب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے) سرکشی بجنور، تاریخ ضلع بجنور، تاریخ فیروز شاہی (مرتبہ)، آئین اکبری (مرتبہ) وغیرہ اُن کی اہم تصانیف ہیں۔

اس کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی سرسید نے مقام پیدا کیا۔ ان کے بڑے بھائی سید محمد نے ''سید الاخبار'' کے نام سے دہلی سے ایک اخبار نکالا تھا۔ سرسید اس کی ادارت و ترتیب و تہذیب میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ یہی تجربہ انہیں اس وقت کام آیا جب انہوں نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ یہ دونوں اپنے وقت کے بہت ہی اہم اخبار و رسائل تھے۔ سرسید نے بیشتر مضامین ان ہی کے لیے لکھے۔ ان کے رفقا، آزاد، شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک، چراغ الملک وغیرہ کے مضامین بھی بیشتر مذکورہ اخبار و رسائل ہی میں شائع ہوئے۔ سرسید اور ان کے رفقا کے مضامین عام طور سے مقصدی اور اصلاحی نوعیت کے ہوتے تھے۔ ''عورتوں کے حقوق'' سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے لیے ہی لکھا تھا جو علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

5. مضمون نگاری کی ترویج و ترقی کے حوالے سے کس ادارے کا نام لیا جاتا ہے؟

6. سرسید کے بعض رفقا کے نام بتایئے۔

7. سرسید کی پیدائش اور موت کی سنہ عیسوی بتایئے۔

8. سرسید کی چند کتابوں کے نام بتایئے۔

4.9 ''عورتوں کے حقوق'' کا متن (اقتباس)

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور رمرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں' کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے۔ اگر تمثلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لیے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپے کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے ..... حقیقت میں اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا گیا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے۔

مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک' مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے' اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے' حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہیے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے تسلیم کر لی ہے اس میں کچھ یہی خیال ہم نے بے پردگی کی آزادی کا نہیں کیا ہے' کیونکہ ہماری رائے میں ہندوستان میں اس باب میں جس قدر کہ تفریط ہے اسی قدر تربیت یافتہ ملکوں میں افراط ہے اور جو حد کہ شرع نے مقرر کی ہے اور جہاں تک کہ انسان اس پر غور کر سکتا ہے اور اپنی عقل کو کام میں لا سکتا ہے۔ بلاشبہ وہی جذبہ نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس مقام پر جو ہم کو بحث ہے وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاشرت اور تواضع اور خاطر داری اور محبت اور پاس خاطر اور

ان کی آسائش اور آرام اور خوشی اور فرحت کی طرف متوجہ ہونا اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گزار تصور کریں، ان کو اپنا انیس اور جلیس اور رنج و راحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور ان کو اپنی باعث مسرت اور تقویت کے سمجھنے پر بحث ہے۔ بلاشبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے اور ہندوستان میں ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا۔

جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں یقیناً ان کی غلطی ہے، بلکہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے۔ صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ معہذا اٹرا باعث اس کا ان سولیز ڈ یعنی نامہذب ہونا مسلمانوں کا ہے۔ مہذب قوموں نے باوجودیکہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا۔ اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچایا ہے۔ اور مسلمانوں نے باوجودیکہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت کی بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے بہتر اور عمدہ تھا۔ مگر انہوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے، الا ماشاء اللہ، اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔ پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں۔ اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھاویں۔

4.10 ''عورتوں کے حقوق'' کی تلخیص

''عورتوں کے حقوق'' سرسید کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس مضمون میں سرسید نے عورتوں کے حقوق کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تربیت یافتہ ممالک یعنی ترقی یافتہ ممالک (Developed Country) میں عام طور سے عورتوں کے مردوں کو برابر سمجھا جاتا ہے بلکہ عورت کی مثال اگر اس معاشرے میں

بائیں ہاتھ کی طرح ہے تو مرد کو دائیں ہاتھ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ سب باتیں اپنی جگہ بجا ہیں لیکن ان کے باوجود مذاہب عالم میں اسلام میں عورتوں کو جس درجہ حقوق و مراعات دیے گئے ہیں وہ کسی اور مذہب میں موجود نہیں ہے۔ لیکن سرسید اس بات پر حیرت اور افسوس کرتے ہیں کہ جس قدر مذہب اسلام میں عورتوں کو عزت و احترام سے دیکھا گیا ہے اور انہیں ان کی مختلف حیثیتوں (ماں، بیوی، بیٹی وغیرہ) کے مطابق حقوق دیے گئے ہیں وہ مسلم ہونے کے باوجود مسلم معاشرے میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ صنف نازک کا یہ طبقہ مسلمہ حقوق کے باوجود بے عزتی، ناقدری اور ظلم و استحصال کا شکار ہے۔

مغربی ممالک کے قوانین میں نہ تو عورتوں کو وہ مقام میسر ہے اور نہ ہی ان کے مذہب میں اس کی تاکید ملتی ہے۔ اس کے باوجود وہاں کی عورتوں کی حالت بہتر اور مثالی ہے۔ بے پردگی اور پردہ داری کا موضوع بحث طلب ہے اور اس سلسلے میں مغرب میں جس قدر آزادی روا رکھی گئی ہے، اس کے خوب و ناخوب ہونے پر بات ہو سکتی ہے لیکن اس سے ہٹ کر اصل بحث یا موضوع ہے مردوں کا عورتوں کے تئیں رویہ، برتاؤ، حسن سلوک، پاس محبت و عزت و احترام یا اسے دوست یا رفیق سمجھنا۔ لیکن مسلمانوں کے معاشرے میں جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یا تو یہ بہت کم یا بالکل نظر نہیں آتیں جب کہ تربیت یافتہ (ترقی یافتہ) ممالک میں مذکورہ باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

جو لوگ مسلمانوں کے تئیں رویے اور برتاؤ کو اسلام اور اسلامی قوانین سے جوڑتے ہیں وہ یقیناً غلطی پر ہیں یہ باتیں اسلامی اقدار و اخلاقیات کے خلاف ہیں۔ یہ تو مسلم معاشرے کی خرابیاں ہیں جو انہوں نے اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر مقامی اثرات کے تحت اور جہالت میں اختیار کی ہیں۔ اسی وجہ سے مسلم عورتوں کی حالت مسلم معاشرے میں انتہائی خراب و ابتر ہے۔ اگر مسلمان اسلامی تعلیمی کی صحیح صحیح پیروی کریں تو وہ نامہذب سے مہذب کہلائیں گے اور دنیا میں بھی سرخرو ہوں گے۔

سرسید نے اپنے اصلاحی مضمون میں مسلمانوں کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے اور عورتوں کے تئیں اپنے رویے میں بدلاؤ لانے کی دعوت دی ہے تاکہ ہم مزید جگ ہنسائی اور مذاق کا موضوع نہ بنیں کیونکہ حسن سلوک اور عزت و احترام ہی اسلام اور مہذب دنیا کا مطالبہ ہے۔

4.11 مضمون ''عورتوں کے حقوق'' کے اہم نکات

i) تربیت یافتہ (ترقی یافتہ) ممالک میں عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر ہیں۔

ii) مغرب میں عورت اور مرد کی مثال دائیں اور بائیں ہاتھ کی طرح ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

iii) مذہب اسلام نے عورتوں اور مردوں کو برابر کا درجہ دیا ہے جو کہ کسی مذہب نے نہیں دیا ہے۔

iv) دنیاوی قوانین میں بھی عورتوں کو وہ حقوق نہیں دیے گئے ہیں جو اسلام نے دیے ہیں۔

v) جس قدر عورتوں کو حقوق اسلام نے دیے ہیں اور اسی قدر مسلم معاشرے میں عورت کی حالت خراب ہے۔

vi) مسلم معاشرے میں عورتوں کی ابتری، بدحالی، ناقدری اور ان پر ہونے والے ظلم و جبر کی اصل وجہ اسلامی تعلیمات نہیں بلکہ اس سے عدم واقفیت یا اسے نظر انداز کرنا ہے۔

vii) مغربی معاشرے میں عورتوں کو جو آزادی اور بغیر کسی پردہ کے باہر نکلنے کے جو مواقع حاصل ہیں وہ ہمارے معاشرے میں عام نہیں ہے۔ اس سلسلے سے ہمیں افراط وتفریط کی جگہ عقل سے کام لینا چاہیے۔

viii) تربیت یافتہ (ترقی یافتہ) معاشرے میں مسلم معاشرے کے برعکس عورتوں کی حالت زیادہ بہتر ہے جب کہ ان کے مذہب میں ان کی حق تلفی کی گئی ہے۔

ix) عورتوں کے تئیں مسلمانوں کا عام رویہ صحت مند اور منصفانہ نہیں ہے اور یہی سبب عورتوں کی بدحالی کا ہے۔

x) تربیت یافتہ معاشرہ اور اسلامی تعلیمات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہمیں عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک اختیار کرنا چاہیے تاکہ اسلام کی اور جگ ہنسائی نہ ہو۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. سرسید نے ''عورتوں کے حقوق'' کس رسالے کے لیے لکھا تھا؟

10. سرسید کے خیال میں مسلم معاشرے میں عورتوں کی پستی کے اسباب کیا ہیں؟

4.12 خلاصہ

اردو کی نثری اصناف میں مضمون نگاری بھی ایک اہم اور مقبول عام صنف ادب ہے۔ جس طرح صنف شاعری میں غزل کو مقبولیت حاصل ہے ٹھیک اسی طرح علمی نثر میں سب سے زیادہ مقبول صنف مضمون نگاری یا مقالہ نگاری ہے۔ لفظ مضمون کو اردو میں مقالہ بھی کہتے ہیں۔ مضمون فارسی کا لفظ ہے اور مقالہ عربی لفظ ہے۔ لفظ مضمون انگریزی لفظ Essay کا ہم معنی ہے۔ مضمون اور مقالہ کو عام طور سے ہم معنی خیال کیا جاتا ہے لیکن دونوں میں تھوڑا یا باریک سا فرق بھی ہے۔ مضمون کسی موضوع پر عام طور سے ایک سرسری وضاحتی بات ہوتی ہے۔ لیکن مقالہ میں کا انداز استدلالی اور منطقی ہوتا ہے۔ مضمون کے اہم اجزا (1) عنوان (2) تمہید (3) وضاحت (4) تجزیہ واستدلال (5) جامعیت اور (6) اخذ نتائج یا خاتمہ ہوتے ہیں۔ مضمون کو (1) علمی وسائنسی (2) ادبی (3) سماجی وعمرانی (4) سیاسی (5) فلسفیانہ (6) تاریخی (7) مذہبی واخلاقی (8) تہذیبی وثقافتی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

آثار الصنادید، اسباب بغاوت ہند، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام (اس کتاب میں اسلام اور عیسائیت مذہب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے) سرکشی بجنور، تاریخ ضلع بجنور، تاریخ فیروز شاہی (مرتبہ)، آئین اکبری (مرتبہ) وغیرہ اُن کی اہم تصانیف ہیں۔ سرسید نے اپنے اصلاحی مضمون میں مسلمانوں کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے اور عورتوں کے تئیں اپنے رویے میں بدلاؤ لانے کی دعوت دی ہے تاکہ ہم مزید جگ ہنسائی اور مذاق کا موضوع نہ بنیں کیونکہ حسن و سلوک اور عزت واحترام ہی اسلام اور مہذب دنیا کا مطالبہ ہے۔

4.13 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **10-10** سطروں میں دیجیے:

1. اردو میں مضمون نگاری کی روایت پر روشنی ڈالیے۔

2. سرسید کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3. عورتوں کے حقوق سے متعلق سرسید کے خیالات کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **30-30** سطروں میں دیجیے:

1. ''مضمون'' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اہم اجزا کی نشاندہی کیجیے۔

2. سرسید کی علمی اور تعلیمی خدمات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

3. مسلم معاشرے میں عورتوں کی پستی کے اسباب سرسید کے خیال میں کیا ہیں؟ ''عورتوں کے حقوق'' کے حوالے سے لکھیے۔

4.14 فرہنگ

آفرینش	پیدائش، ابتدا
مساوی	برابر
بمنزلہ	درجہ بدرجہ
بالعکس	الٹا، ضد
افراط وتفریط	حد سے بڑھی ہوئی، زیادتی اور کمی
شرع	قانون محمدی ﷺ، راہ راست، وہ راہ راست جو خدائے تعالیٰ نے بندوں کے واسطے پیدا کی اور جس کا حکم فرمایا
تواضع	خاطر داری، آؤ بھگت
بعوض	بدلے میں
انیس	دوست
جلیس	ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا، برابر
تنزل	گراوٹ، پستی
ناقص	خراب، بگڑا ہوا

نعوذ باللہ منہا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے

4.15 معاون کتابیں

.1	سرسید اوران کے نامور رفقا	سید عبداللہ
.2	سرسید اوران کے کارنامے	نورالحسن نقوی
.3	سرسید ایک تعارف	خلیق احمد نظامی
.4	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق

4.16 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

.1 فارسی

.2 مضمون کو انگریزی میں Essay اور ہندی میں نی بندھ کہتے ہیں۔

.3 (1) عنوان (2) تمہید (3) وضاحت (4) تجزیہ واستدلال (5) جامعیت (6) اخذ ونتائج

.4 علمی، ادبی، سماجی، سیاسی، تاریخی، فلسفیانہ، مذہبی، اخلاقی وغیرہ

.5 دلی کالج

.6 محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک وغیرہ

.7 1817ء اور 1898ء

.8 (1) آثار الصنادید (2) اسباب بغاوت ہند (3) خطبات احمدیہ (4) تبیین الکلام

.9 تہذیب الاخلاق کے لیے

.10 سرسید کی نظر میں مسلم معاشرے میں عورتوں کی پستی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

1) جہالت 2) اسلامی تعلیمات سے دوری

3) مقامی غلط قسم کے رسم ورواج کی اندھی پیروی اور

4) مہذب معاشرے کے صحت مند عناصر سے پرہیز

اکائی 12: شبلی نعمانی: ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر''

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 شبلی کے حالات زندگی

5.4 شبلی کی ادبی اہمیت اور نثر کی خصوصیات

5.5 شبلی کے مضمون ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر'' کا متن (اقتباس)

5.6 ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر'' کا تجزیہ

5.7 خلاصہ

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

5.9 فرہنگ

5.10 معاون کتابیں

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

5.1 اغراض ومقاصد

اس سبق کا مقصد طلبا کو مولانا شبلی نعمانی کی حیات اور ان کی تحریروں سے واقف کرانا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی زندگی کے تعلق سے آپ کو کچھ بنیادی اطلاعات فراہم کی گئی ہیں تا کہ آپ ان کی شخصیت اور خدمات سے واقف ہو سکیں۔ پھر علامہ شبلی کے مشہور مضمون ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' کی ادبی وفنی اہمیت اور ان کی نثر کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے تا کہ شبلی کی نثر نگاری اور بطور خاص اس مضمون کی تفہیم میں آسانی ہو۔ آپ اصل متن (text) سے واقف رہیں، اس لیے متن کا اقتباس بھی شامل اکائی ہے تاہم تجزیے میں مکمل مضمون کا احاطہ کیا گیا ہے۔

5.2 تمہید

1857ء کا سال ہمارے ملک کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال صرف مغل سلطنت کا خاتمہ ہی نہیں ہوا بلکہ ایک تہذیب ختم ہوگئی۔ انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ہی فکر کا ایک نیا انداز آیا اور ایک نئی تہذیب نے اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اردو کے ادیبوں نے انگریزی ادب کے مقابلے اپنے ادب کو ناکارہ اور بے مصرف جانا، شاعری میں عشق و عاشقی کے قصے بقول مولانا حالؔی بے وقت کی راگنی محسوس ہوئے۔ نثر کا مصنوعی انداز اظہار خیال کے راستے کی رکاوٹ سمجھا گیا۔ اہل ادب اپنی نثر و نظم کی دنیا کو یکسر تبدیل کرنے کی فکر کرنے لگے۔ اس دور میں اردو ادب کو کئی اہم نثر نگار میسر ہوئے جن میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کا نام سرفہرست ہے، علمی نثر اور سائنسی نثر کی اصطلاحات عام ہونے لگیں۔ سرسید سے متاثر نثر نگاروں میں علمی موضوعات پر اظہار خیال کرنے والوں میں علامہ شبلی نعمانی کا بڑا مرتبہ ہے۔

5.3 شبلی کے حالات زندگی

شبلی اعظم گڑھ ضلع کے بندول گاؤں میں یکم جون 1857ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا، زمینداری، نیل کی تجارت اور وکالت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ شبلی بچپن سے ہی ذہین تھے۔ ان کی والدہ ایک دین دار اور مذہبی خاتون تھیں۔ شبلی کی تعلیم قدیم انداز پر شروع ہوئی۔ حرف شناسی کے بعد قرآن پاک ختم کیا پھر فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا۔ عربی اپنے گاؤں بندول سے نکل کر جونپور اور غازی پور کے بعض مدرسوں میں پڑھی۔ 1873ء کے آس پاس شبلی کے والد اور دوسرے معززین شہر نے اعظم گڑھ میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی اور مشہور عالم مولانا فاروق چریا کوٹی کو اس مدرسے کا صدر مدرس مقرر کیا۔ شبلی نے عربی تعلیم کے تمام بنیادی مراحل اسی مدرسے میں مولانا فاروق چریا کوٹی کی نگرانی میں طے کئے۔

شبلی نعمانی کے دوسرے اساتذہ میں مولانا ارشاد حسین رام پوری (رام پور) اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری (لاہور) کے اسماء شامل ہیں۔ شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کیا وکالت بھی شروع کی لیکن اس میں دل نہیں لگا۔

کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی عارضی ملازمت کی۔ قرق امین کی اسامی پر کام کیا نیل کے کارخانوں کی نگرانی کی لیکن کہیں دل نہ لگا۔ جنوری 1883ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ (جواب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کہلاتی ہے) میں اسٹنٹ پروفیسر عربی کی نوکری کی۔ علی گڑھ میں شبلی کا قیام کم وبیش 16 سال رہا۔ یہیں شبلی علامہ شبلی نعمانی بنے۔ یہاں انھیں سرسید کی صحبت میسر آئی۔ یہیں وہ ادیب، عالم، خطیب، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے ابھرے۔ علی گڑھ سے ہی علامہ شبلی نعمانی پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ روم وشام اور مصر کی سیاحت پر گئے۔ اس سفر نے شبلی نعمانی کے ذہنی افق کو وسیع کیا۔ 1892ء میں کان پور میں انجمن ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تو شبلی نعمانی اس انجمن کے سرگرم کارکن بن گئے۔ 1896ء میں شبلی نعمانی نے حیدر آباد کا سفر کیا اور علی گڑھ سے رخصت لے کر حیدر آباد میں سرکاری وظیفے پر علمی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ 1898ء میں علی گڑھ کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور 1905ء تک حیدر آباد میں مقیم رہے۔ اس دوران علم الکلام، الکلام اور موازنہ انیس ودبیر وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔

اپریل 1905ء میں علامہ شبلی نعمانی دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے اور لکھنؤ کی اقامت اختیار کی۔ ندوے سے شبلی کی وابستگی 1913ء تک رہی۔ اس دوران میں انھوں نے ندوۃ العلماء کی ترقی اور اصلاح کے لئے بہت سے نمایاں خدمات انجام دیں اور وہاں کے نصاب کو بہتر بنایا۔ انھوں نے ندوہ کے طلباء کے لئے انگریزی کو لازمی قرار دیا۔ آخر میں ندوہ کے ارکان سے اختلافات پیدا ہوئے جس کی وجہ سے شبلی نے جولائی 1913ء میں وہاں کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اعظم گڑھ میں دار المصنفین نام کا ایک ادارہ قائم کرنے کا ارادہ تھا، اس ادارے کے بعض ابتدائی مراحل طے بھی ہو چکے تھے کہ 18 نومبر 1914ء کو پیام اجل آ گیا اور اعظم گڑھ میں انتقال کیا۔ تصانیف شبلی میں سیرۃ النبی، سیرت نعمان، الفاروق، المامون، شعر العجم (پانچ جلدیں) مقالات شبلی (سات جلدیں) اور سوانح مولانا روم وغیرہ کتب شامل ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. شبلی نعمانی کس سن میں پیدا ہوئے؟
2. شبلی نعمانی کی تاریخ وفات کیا ہے؟

3. شبلی نعمانی ندوۃ العلماء سے کس حیثیت سے وابستہ رہے؟

4. شبلی کے قیام حیدر آباد کی مدت کس سن سے کس سن تک ہے؟

5. شبلی کی تین کتابوں کے نام بتایئے۔

5.4 شبلی کی ادبی اہمیت اور نثر کی خصوصیات

مولانا شبلی اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یک رخے اور یک فنے نہیں ہیں۔ وہ عالم بھی ہیں فقیہ بھی اور شاعر و ادیب بھی۔ انھوں نے پروفیسر آرنلڈ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں سے وہ نہ صرف واقف تھے بلکہ تینوں میں صاحب ذوق اور صاحب تصانیف تھے۔ مغربی زبانوں میں فرنچ سے کسی قدر واقفیت رکھتے تھے۔ تنوع، رنگارنگی اور پہلوداری کی یہی کیفیت ان کے علمی و ادبی کارناموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ادیب، انشا پرداز، شاعر، ناقد، ماہر علم کلام، مورخ، سوانح نگار اور سیرت نگار غرض ہر حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو ہر جگہ ایک سے زیادہ پہلو نظر آئیں گے مثلاً ان کی انشا پردازی نہ حالؔی کی طرح سادہ سپاٹ اور خشک ہے نہ محمد حسین آزادؔ کی طرح مرصع رنگین اور تشبیہات سے پُر بلکہ دونوں کی ملی جلی کیفیت لئے ہوئے ہیں۔ بحیثیت شاعر وہ نظم گو بھی ہیں اور غزل گو بھی۔ انھوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور مثنویاں بھی، رباعیاں بھی کہی ہیں اور مثنویاں بھی، سنجیدہ شاعری بھی کی ہے اور طنزیہ بھی۔ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو میں بھی۔ یہی حال ان کی تنقید نگاری کا بھی ہے ایک طرف انھوں نے حافظ سعدی اور خسرو جیسے شاعروں کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے تو دوسری طرف اردو شاعروں میں انیس و دبیر کے کلام کا موازنہ اور مقابلہ بھی کیا ہے۔

مولانا شبلی ہماری زبان کے مستند اور صاحب طرز نثر نگاروں میں شامل ہیں۔ بلکہ ادبی خدمات کے تعلق سے ان کی یہ حیثیت سب سے زیادہ اہم ہے۔ مولانا شبلی کے معاصر ادیبوں اور نثر نگاروں میں سرسید، محمد حسین آزادؔ، نذیر احمد اور حالؔی سرفہرست ہیں۔ مولانا شبلی کا طرز اپنے ان تمام معاصرین سے الگ اور جداگانہ ہے۔ سرسید کے یہاں جا

بجا نامانوس اور ثقیل الفاظ آجاتے ہیں، محمد حسین آزاد تشبیہات و استعارات اور مناسبات لفظی کے بغیر قدم نہیں بڑھاتے' نذیر احمد کو محاورے بے حد عزیز ہیں وہ ان پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ حالی کی نثر اکثر اوقات خشک اور روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ ان سب کے برخلاف شبلی کی نثر میں ایک طرف توازن و اعتدال اور دوسری جانب ایک خاص طرح کا احساس جمال پایا جاتا ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ شبلی لفظوں کے پارکھ ہیں۔ ہر لفظ کو بقول خود اقتضائے حال کے موافق استعمال کرتے ہیں۔ نہ صرف معنوی بلکہ صوتی مناسبتوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ہاں رعایت لفظی کو پسند نہیں کرتے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے اسلوب میں علمیت و ادبیت کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ مولانا شبلی کی تحریروں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس میں کسی قسم کا جھول نہیں پایا جاتا۔ ہر جملہ اور ہر فقرہ سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ اس لئے کہ وہ کچھ کہنے سے پہلے ذہن میں مناسب ترتیب قائم کر لیتے ہیں تب خیال کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

مولانا شبلی کے مزاج کو محاکات اور مرقع کشی سے خاص مناسبت ہے اس لئے جب وہ کسی واقعے، جذبے، حالت یا کیفیت کی تصویر کشی کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی نثر خاص طور پر حسین اور دلآویز ہو جاتی ہے دراصل ان کا خیال تھا کہ نثر ہو یا نظم بلاغت کا معیار یہ ہے کہ جس کیفیت سے متکلم دوچار ہو وہی مخاطب پر بھی طاری ہو جائے۔ اسی لئے محاکات کے موقع پر ان کی تحریریں زیادہ بلیغ اور موثر ہو جاتی ہیں۔ المامون، الفاروق اور سیرۃ النبی کے علاوہ ان کے خطوط میں اس کی مثالیں آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔

شبلی کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خطوط نگاری میں ان کا کوئی متعین اسلوب نہ تھا۔ مخاطب کے معیار و مذاق کے لحاظ سے ان کا طرز بیان بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مفصل خطوط لکھتے اور کبھی محض ایک آدھ جملوں پر اکتفا کر لیتے۔ جس طرح عام زندگی میں خود کو لئے دیے رہتے اسی طرح خطوط بھی محتاط ہو کر لکھتے۔ البتہ بے تکلف دوستوں کو خطوط بھی بے تکلفانہ لکھتے۔

شبلی نے مستقل کتابوں کے علاوہ متعدد موضوعات پر درجنوں بلند پایہ مقالات بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان مقالات سے شبلی کے مطالعے کی وسعت اور علمی ذوق و شوق کے تنوع کا بھی اندازہ ہوتا ہے یہ مقالات ملک کے مختلف

رسائل و جرائد مثلاً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، معارف، تہذیب الاخلاق، دکن ریویو، الندوہ اور مسلم گزٹ میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں۔

ان مقالات کے دو مجموعے مولانا کی زندگی میں ''رسائل شبلی'' اور ''مقالات شبلی'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان مجموعوں کے علاوہ بھی شبلی کے مقالات مختلف موضوعات پر مختلف اخبارات و رسائل میں بکھرے ہوئے تھے۔ جنھیں مولانا شبلی کے شاگردوں مسعود علی ندوی اور معین الدین قدوائی نے شائع کیا اور نئے پرانے تمام مقالات نئے سرے سے ترتیب دے کر موضوعات کے لحاظ سے آٹھ جلدوں میں مقالات شبلی کے نام سے جمع کر دیے ہیں۔

ان آٹھ جلدوں میں مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی، فلسفیانہ اور قومی و اخباری مضامین شامل ہیں۔ ادبی مقالات کے مجموعے ''مقالات شبلی حصہ دوم'' میں شبلی کا ایک مضمون ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' موجود ہے جس میں سرسید احمد خاں کی اردو مضمون نگاری کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ے نصاب میں شبلی کا یہ ادبی مضمون شامل ہے اب، ہم اس مضمون کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

6. شبلی کے معاصر نثر نگاروں کے نام لکھیے۔
7. شبلی مقالہ نگاری میں کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟
8. مقالات شبلی کے کتنے حصے ہیں؟ ان کے موضوعات لکھیے۔
9. شبلی کی نثر میں محاکات کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی مثالیں ان کی کن کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں؟

5.5 شبلی کے مضمون ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر'' کا متن (اقتباس)

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں، اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں سے ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین

اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کی استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں، ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں۔ جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمراں ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں، جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا ہے۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے؟

سرسید کی جس زمانے میں نشو و نما ہوئی، دلی میں اہل کمال کا مجمع تھا، اور امرا اور روسا سے لے کر ادنیٰ طبقہ تک میں علمی ذوق پھیلا ہوا تھا۔ سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے، اس کے بڑے بڑے ارکان مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا غالبؔ اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا، اور انہیں بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا، وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔

اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے۔ آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔ جس کا ایک مصرعہ انہیں کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے۔ ع نام میرا تھا، کام ان کا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، اس لیے وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی، چوں کہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا، اس لیے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دے کر 1847ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی، جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض عمدہ نمونے موجود تھے۔ خصوصاً میر امن صاحب کی 'چہار درویش'، جو 1802ء میں تالیف ہوئی تھی اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجود تصنیفات کی برابری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا، یعنی عمارات اور آثار کی تاریخ، وہ تکلف اور آورد سے ابا کرتا تھا، تاہم 'آثار الصنادید' میں اکثر بیدلؔ اور ظہوریؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی۔ اور مولانا موصوف بیدل کے ایسے دل دادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے اس طرز میں لکھتے تھے۔

سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ 'آثار الصنادید' کے بعض بعض مقامات بالکل امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے۔

بہر حال اس کتاب میں جہاں انشا پردازی کا زور دکھایا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

''ان حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب فہم وذکا اور ناخن فکر عقدہ لاینحل کو پہلے اس سے ادا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا۔ معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا۔ اور رمز شناسی اس درجہ کو واقعی معلوم ہو گیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا۔ اگر ان کی رائے روشن' معجز نما ہو تو نقطہ' موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے' اور جزو لایتجزیٰ کو دو نیم۔''

اگر چہ اس سے بہت پہلے یعنی 1836ء میں مولوی محمد حسین کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا۔ اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام 'سید الاخبار' تھا، اور دونوں کی زبان ضرورت کی اقتضا سے زیادہ صاف ہوا کرتی تھی۔ اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے لکھتا تھا۔ تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ سے 'آثار الصنادید' میں جہاں انشا پردازی سے کام لیا' اسی طرز کو برتا۔

'آثار الصنادید' جس زمانہ میں نکلی' اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً 1850ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالبؔ نے اردو کی طرف توجہ کی۔ یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے اور چوں کہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے' اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے۔ جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس

کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج وغم، مسرت وخوشی، حسرت و بے کسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشا پردازوں کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالبؔ نے رکھا تھا، اور سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لیے کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہو گئے اور اردو انشا پردازی کو روز بہ روز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا۔ اس لیے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اسٹائل معین نہیں ہوا تھا۔ س کے علاوہ جو کچھ تھا وہ ابتدائی حالت میں تھا۔

1287ھ میں جس کو آج کم وبیش 27 برس ہوئے۔ سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' کا پرچہ نکال اور اردو انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا، جس کے آگے اب ایک قدم بھی بڑھنا ممکن نہیں۔ سرسید نے اردو میں جو باتیں پیدا کیں، اس کو وہ مختصراً ''تہذیب الاخلاق'' میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ ان کی خاص عبارت یہ ہے:

> ''جہاں تک ہم سے ہوسکا، ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں، اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے، جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں بھری ہوئی، اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو، مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''

اس آرٹکل میں سرسید نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بنائے ہیں، جن کو اس موقعہ پر اختصار کی وجہ

سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ، بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے، اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی، اردو میں بڑے بڑے شعراء اور نثار گزرے ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔ فردوسیؔ بزم میں رہ جاتا ہے۔ سعدیؔ رزم کے مرد میدان نہیں۔ نظامیؔ رزم، بزم دونوں کے استاد ہیں۔ لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں، ظہوریؔ صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرے، پالٹکس مناظرِ قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔

''دیکھ ناداں! بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے۔ اور اس کے گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ بات کام میں اور دل بچہ میں ہے۔ اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے، سورہ! میرے بچے، سورہ! اے اپنے باپ کی مورت، اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ! اے میرے دل کی کونپل، سورہ! تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے۔ سورہ، میرے بچے سورہ! میری آنکھوں کے نور، اور میرے دل کے سرور، میرے بچے، سورہ! تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت، جو تم ہم سے کرے گا، ہمارے دل کو تسلی دے گی۔ سورہ، میرے بچے سورہ! سورہ، میرے بالے سورہ!''

''یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں، جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا، اور معصوم، ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا، اور اماں اماں کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز، ادھورے لفظوں میں، اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی

آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر کتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو ماں کے سامنے، دن کو پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا، اور جب کہ وہ تاروں کی چھانو میں اٹھ کر، منھ ہاتھ دھوکر، اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا۔ تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں، اور پیاری امید ہی تو ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔''

''وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں ایک عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا، زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال، اس کے دل کو تقویت دیتا ہے۔ اس کا کان نقارہ میں سے تیری ہی آواز سنتا ہے۔''

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور اس میں کس قدر درد و اثر پیدا کیا ہے۔

5.6 ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر'' کا تجزیہ

شبلی نعمانی سرسید کے ہر کارنامے میں جذبۂ اصلاح کو روح کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر اردو لٹریچر یعنی اردو ادب کے بارے میں شبلی کا خیال ہے کہ وہ سرسید کی اصلاحات کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بن گیا۔

شبلی کا خیال ہے کہ پہلے اردو ادب محض عشق و عاشقی کی داستان بیان کرنے کا ایک ذریعہ تھا اور اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔ سرسید کی بدولت ہی اردو اس تنگ دائرے سے نکل کر اس قابل ہوئی کہ اس میں ملکی، سیاسی، اخلاقی اور

تاریخی غرض ہر قسم کے مضامین اپنے پورے اثر کے ساتھ ادا ہونے لگے۔ سرسید سے قبل اردو محض عشقیہ شاعری اور فسانۂ عشق کے مضامین ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ شبلی کا خیال ہے کہ علمی مضامین اور مقالات کے مضامین کی متحمل اردو زبان سرسید کی وجہ سے ہی ہو پائی۔ شبلی کا خیال ہے کہ اردو میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال اور انشاء پردازی کرنے والے اپنے مخصوص مضامین میں کسی قدر کمال رکھتے ہوں سرسید کے احسان کے بار سے ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ ایسے لوگوں کو شبلی نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے اول سرسید کے تربیت یافتہ دوئم دور سے سرسید کے نظریات اور انکی تحریروں سے فائدہ اٹھانے والے اور سوئم ادب وانشاء کے تعلق سے سرسید کی مخالفت کرنے والے لیکن علامہ شبلی کے بقول ان میں سے کوئی بھی سرسید کی فیض پذیری سے آزاد نہیں یعنی سید کا فیض ان سب کو پہنچا ہے۔ شبلی کہتے ہیں کہ سرسید نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، دلی میں علم وادب سے تعلق کسی خاص طبقے کی صفت نہیں تھی بلکہ پورے شہر میں باکمال افراد کا مجمع تھا اور ادنیٰ اعلیٰ ہر طبقے کے لوگ علم وادب کا ذوق رکھتے تھے۔ سرسید اس سوسائٹی کے ممبر تھے جس میں مرزا غالبؔ، مولانا امام بخش صہبائیؔ اور مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ موجود تھے۔

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر نامی مضمون کے اگلے حصے میں شبلی نعمانی سرسید احمد خاں کی ابتدائی ادبی زندگی کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ اس وقت عام رواج شاعری کا تھا ہر شخص شاعری ضرور کرتا تھا اس لئے سرسید نے بھی شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور آہیؔ تخلص اختیار کیا۔ شبلی نے اس سلسلے میں سرسید کی ایک مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کا ایک مصرعہ بطور اقتباس پیش بھی کیا ہے جو سرسید کی زبان سے سنا ہوا شبلی کو یاد تھا۔ مصرعہ یوں ہے۔

ع نام میرا تھا' کام ان کا تھا

شبلی نعمانی آگے کہتے ہیں اصل میں سرسید کو شاعری سے مناسبت نہ تھی اس لئے وہ بہت جلد اس سے کنارہ کش ہو گئے اور شاعری کے کوچے کو خیر باد کہہ کر نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ سیر سید کی طبیعت میں حقیقت اور واقعات کی جانب جھکاؤ شروع سے تھا اس لئے انھوں نے دلی کی تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات اور چھان بین شروع کی اور بہت محنت اور کوشش سے اس کام کو انجام دیا۔ نتیجے کے طور پر 1847ء میں ایک تفصیلی کتاب تیار ہوئی جس کا نام سرسید احمد

خاں نے آثار الصنادید رکھا۔ یہ کتاب آج تک اس نام سے مشہور ہے اور سرسید کا ایک گراں قدر علمی کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ جس وقت سرسید نے آثار الصنادید لکھی اس وقت ان کے سامنے اردو نثر کے بہت عمدہ نمونے موجود تھے خاص طور پر میر امن کی کتاب ''قصہ چہار درویش'' جو 1802ء میں فورٹ ولیم کالج میں تیار کی گئی تھی اور جس میں نثر کی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ جنھیں سرسید احمد خاں نثر کی ترقی کے لئے لازمی سمجھتے تھے یعنی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی۔ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے یہ کتاب آج بھی موجودہ کتابوں کے ساتھ رکھی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں جو مضمون اپنایا گیا ہے یعنی قدیم عمارتوں اور پرانی تعمیرات کی تاریخ، وہ پر تکلف اور زبردستی کی عبارت آرائی کی گنجائش نہیں رکھتا۔ شبلی کے خیال میں آثار الصنادید فارسی کے بڑے قلم کاروں بیدلؔ اور ظہوریؔ کی نثر کا رنگ لئے ہوئے ہے۔

مولانا شبلی آثار الصنادید میں بیدل اور ظہوری کے رنگ پائے جانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں سرسید آثار الصنادید لکھ رہے تھے ان کا اٹھنا بیٹھنا مولانا امام بخش صہبائی کے ساتھ زیادہ تھا اور مولانا صہبائی بیدلؔ کے عاشق تھے، رات دن ان کا ذکر کرتے تھے اور جو لکھتے بیدلؔ کی ہی طرح لکھتے۔ شبلی کہتے ہیں کہ ''سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض مقامات مولانا صہبائی کے ہی لکھے ہوئے ہیں'' جو انھوں نے سرسید کے نام سے لکھ کر شامل کتاب کر دیے۔

شبلی کہتے ہیں کہ آثار الصنادید کی اشاعت سے بہت پہلے 1836ء میں محمد حسین آزادؔ کے والد مولوی محمد باقر نے ''اردو اخبار'' کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا اور خود سرسید نے ''سید الاخبار'' کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا تھا۔ دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کے لحاظ سے بہت سادہ اور صاف تھی۔ لیکن اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں مانی جاتی تھی اس لئے جب کوئی شخص ایسی تحریر لکھتا جسے علمی زبان کا حامل قرار دینا ہوتا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی جہاں آثار الصنادید میں عبارت آرائی اور انشاء پردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا ہے۔

آثار الصنادید جس زمانہ میں شائع ہوئی اس کے کچھ دنوں بعد تقریباً 1850ء میں مرزا غالبؔ نے اردو نثر نگاری کی طرف توجہ کی اور خطوط وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کئے۔ غالبؔ کا معاملہ ہر جگہ منفرد رہا ہے یعنی وہ جس طرف

متوجہ ہوتے اپنی راہ الگ نکالتے۔ اس لئے انہوں نے اپنے تمام معاصرین کے برخلاف مکاتبہ یعنی تحریر کو مکالمہ یعنی گفتگو میں تبدیل کر دیا۔ غالبؔ خطوط میں اس طرح اپنی باتیں کرتے ہیں جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ خطوط میں انسانی جذبات، خوشی، غم، حسرت، مسرت، بے بسی، بے کسی وغیرہ کو بہت خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ شبلی غالبؔ کے خطوط میں اپنی معروف اصطلاح محاکات والی صفت بھی تلاش کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں ''اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔'' شبلی کہتے ہیں کہ اردو نثر کے جس انداز کا امام سرسید احمد خاں کو سمجھا جاتا ہے اس کا سنگ بنیاد اصلاً مرزا غالبؔ نے رکھا تھا۔ شبلی مزید کہتے ہیں کہ غالبؔ سے سرسید کا جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے اسی لئے اس بات میں کچھ شبہ نہیں کہ سرسید نے غالبؔ سے ضرور فائدہ اٹھایا ہے۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ سرسید کے زمانے میں ہندوستان کے ہر حصّے سے اردو اخبارات کی اشاعت شروع ہوگئی اور اردو نثر کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبار ہر طرح کے مضامین سے پُر ہوتے تھے یعنی اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی وغیرہ مسائل سے متعلق، لیکن اردو نثر کا باضابطہ کوئی طریقہ وضع نہیں ہوا تھا اور جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔ اس کے بعد شبلی سرسید کے نظریۂ اصلاح کی داد دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ 1287ھ میں سرسید نے قوم کی اصلاح کے لئے 'تہذیب الاخلاق' نامی رسالے کا اجرا کیا اور اردو انشاء پردازی یعنی مضمون نگاری کو اپنے کمال پر پہنچا دیا۔ اس حوالے سے شبلی اپنے اس مضمون میں تہذیب الاخلاق میں شائع سرسید احمد خاں کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں سرسید نے اپنی قلمی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ جہاں تک ہم سے ممکن ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے پرچوں کے ذریعہ کوشش کی۔ رنگین عبارات اور تشبیہات و استعارات سے پُر اور شوکتِ الفاظ سے آراستہ مضامین، جن سے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا جان بوجھ کر پرہیز کیا اور سیدھے سیدھے بات کو کہنے کا طریقہ اپنایا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ اچھائی ہو مضمون کے ادا کرنے میں ہو اور جو اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

شبلی سرسید کے اس مضمون کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے اس میں اردو نثر کے بہت سے اصول

بتائے ہیں۔شبلی ان اصولوں کی تفصیل بیان نہیں کرتے لیکن اشارہ ضرور کر دیتے ہیں جس سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ سرسید اردو نثر کو کس طرح کی ترقی دینے کے خواہش مند تھے اور اس میں کس طرح انھوں نے کامیابی حاصل کی۔

سرسید کی نثر نگاری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر موضوع اور ہر مضمون پر خوب لکھا ہے اور اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر لکھنا ناممکن ہے۔شبلی جیسا وسیع المطالعہ عالم اس بات کو زور دے کر کہتا ہے کہ اردو فارسی میں بڑے بڑے شعراء اور نثار بھی تمام قسم کے مضامین کا حق اس طرح نہ ادا کر پائے جیسا کہ سرسید نے کیا۔اس حوالے سے شبلی، فردوسی، سعدی، نظامی، ظہوری وغیرہ کی نثر اور نظم کی صفات بیان کرتے ہیں اور انھیں کہیں نہ کہیں کمزور ثابت کر کے اپنے ہیرو سرسید احمد خاں کو لاجواب انشاء پرداز ثابت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔'' اس حوالے سے شبلی نعمانی سرسید کے مشہور مضمون ''امید کی خوشی'' سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں جن میں انسانی جذبات کی بڑی سچی عکاسی سرسید احمد خاں کے قلم نے کی ہے۔ایک اقتباس میں بچہ جو ماں کی امیدوں کا مرکز ہے گہوارے میں سوتا ہے اور ماں اس کے تعلق سے اپنے جذبات محبت کا اظہار کرتی ہے اور اسے لوری دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دوسرے اقتباس میں سرسید نے اسی بچے کے لڑکپن کی کیفیت بیان کی ہے۔جس میں وہ غوں غاں کرنے لگا ہے اور اپنے آنسوؤں سے اپنی ماں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھی کوشش کر رہا ہے۔بتدریج ترقی کرتا ہوا وہ لڑکا مدرسہ کی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے اور خدا کا نام لینا سیکھتا ہے تو ماں کی امیدیں دوچند ہو جاتی ہیں۔

تیسرے اقتباس میں وہ بچہ دلاور سپاہی بن کر میدان میں کھڑا ہے اور امید ہی اسے فتح کی کیفیت سے سرشار کر دیتی ہے اور فتح کا خیال اس کے دل کو طاقت بخشتا ہے۔

ان تینوں اقتباسات کو نقل کر کے شبلی بیان کرتے ہیں کہ سرسید نے ان سطور میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور کتنا درد و اثر پیدا کیا ہے۔شبلی مزید کہتے ہیں کہ سیاست کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔آگے چل کر شبلی سرسید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس وقت کی بات کرتے ہیں جب پنجاب میں یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی اور اورینٹل

تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا تھا۔ سرسید کا خیال تھا کہ یہ مناسب نہیں ہے اس لئے انھوں نے پے در پے تین مضامین لکھے ان مضامین سے یونیورسٹی کے بانیوں میں کھلبلی مچ گئی۔

شبلی سرسید کی نثری ترقی کے تعلق سے کی گئی خدمات کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے نثر کی ترقی کا ایک طریقہ یہ بھی ایجاد کیا کہ اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو کا جامہ پہنایا لیکن ترجمے کے ذریعہ نہیں بلکہ انگریزی خیالات کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور اس بات کی بھی کوشش کی کہ اردو زبان کی خصوصیات قائم رہیں۔ اس حوالے سے علامہ شبلی ''امید کی خوشی'' مضمون کا ذکر کرتے ہیں جو ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ ایڈیسن اور اسٹیل نامی انگریزی کے مشہور مضمون نگاروں کا ذکر بھی شبلی اسی ضمن میں کرتے ہیں۔ جن کے متعدد مضامین کو سرسید نے اپنی زبان میں ادا کیا۔ علمی مسائل کی بحث میں سرسید احمد خاں جو طریقہ استعمال کرتے ہیں شبلی نے اس کی بھی خوب داد دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علمی مضامین کے برتنے کے لئے اردو میں اصطلاحات کم ہونے کی وجہ سے اردو میں الفاظ علمی مسائل کے بیان میں ناکافی معلوم ہوتے ہیں اور مدد نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سرسید کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مشکل سے مشکل مسائل کو بھی باکمال طریقے سے ادا کر دیا اور اپنے مضمون میں لطف کے پہلو کو باقی رکھا۔

اس تعلق سے شبلی پروفیسر رینان کا حوالہ دیتے ہیں جو عربی زبان میں فلسفیانہ مسائل کی ادائیگی کی صلاحیت نہیں پاتا شبلی اُس کے خیال کو غلط قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ''کہ سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیے ہیں'' اپنے اس بیان کی سند کے طور پر شبلی سرسید کے الٰہیات کے موضوع پر لکھے گئے مضامین کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس موقع پر اس خراج عقیدت کے مضمون میں بھی شبلی سرسید سے اپنے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمانہ واقف ہے کہ مذہبی معاملات میں سرسید کی آرا سے مجھے سخت اختلاف تھا۔ لیکن اس کے باوجود سرسید نے مذہبی مسائل کو جس طرح اردو زبان میں اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے اس طرح کوئی دوسرا بیان نہیں کر سکتا۔

سرسید کی تحریروں میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً ظرافت، شوخی، سوز، محبتِ قوم، جذبۂ ہمدردی وغیرہ

انھیں شبلی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ سرسید احمد خاں پر کفر کا فتویٰ لگا جو صاحب یہ فتویٰ لینے حرمین شریفین یعنی مکّہ معظّمہ اور مدینہ منورہ گئے ان کے بارے میں سرسید نے جو کچھ لکھا ہے اس کی داد دیتے ہوئے شبلی سرسید کا اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں سرسید نے کہا ہے کہ ''ان صاحب کو ہمارے کفر کی بدولت حج اکبر نصیب ہوا'' سرسید کہتے ہیں کہ ''ہمارا کفر کسی کو حاجی (حج کرنے والا) اور کسی کو ہاجی (ہجو یعنی برائی کرنے والا) بناتا ہے۔ ہم بھی ان فتوؤں کو دیکھنے کے مشتاق ہیں۔'' سرسید ایک شعر بھی نقل کرتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ

اے شیخ میرے بت خانے کی کرامت دیکھ کہ وہ جب خراب ہوا تو خانۂ خدا بن گیا

بت خانہ کے خراب ہونے کا مطلب اس سے بتوں کا نکل جانا ہے اور سب جانتے ہیں کہ خانۂ خدا یعنی کعبۃ اللہ سے جب بت نکل گئے تو وہ خدائے واحد کی عبادت کا مرکز قرار پایا۔

تہذیب الاخلاق کے بند ہونے پر سرسید نے جو مضمون لکھا اس کو بھی شبلی سرسید کی دردمندی اور حُبِ قومی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا بھی اقتباس مثال میں پیش کرتے ہیں۔

آخر میں شبلی کہتے ہیں کہ سرسید کی ادبی خدمات کا ذکر کرنے کے لئے چند صفحات کافی نہیں ہیں۔ شبلی یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسید کی ادبی خدمات کا ذکر کرنے کا حق مولانا الطاف حسین حالؔی رکھتے ہیں۔ مجھے تو کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ میں اس وقت میں جب سرسید اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ہر شخص ان کے کارنامے سننا چاہتا ہے مختصراً کچھ لکھوں۔ میں نے اسی حکم کی تعمیل کی ہے ورنہ میں مولانا حالؔی کے علاقے میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ شبلی سرسید کی خدمات کے بارے میں لکھنے کا سارا حق مولانا حالؔی کو دیتے ہیں اور اپنے مضمون کا اختتام میر انیسؔ کے مشہور شعر پر کرتے ہیں ؎

بھلا تردّد بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

5.7 خلاصہ

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ ضلع کے بندول گاؤں میں یکم جون 1857ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ زمینداری، نیل کی تجارت اور وکالت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ شبلی کا انتقال 18 نومبر 1914ء کو اعظم گڑھ میں ہوا۔ تصانیف شبلی میں سیرۃ النبی، سیرت نعمان، الفاروق، المامون، شعرالعجم (پانچ جلدیں) مقالات شبلی (سات جلدیں) اور سوانح مولانا روم وغیرہ کتب شامل ہیں۔ مولانا شبلی ہماری زبان کے مستند اور صاحب طرز نثر نگاروں میں شامل ہیں۔

اپنے اس مضمون ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر'' میں اپنے عہد اور بعد کے ہر عہد کے بڑے نقاد، عالم اور انشاء پرداز علامہ شبلی نعمانی نے جدید نثر کے ایک بڑے محسن سرسید احمد خاں کی ادبی خدمات اور بطور خاص اردو نثر میں کی گئی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انھوں نے سرسید کو ان کے افکار، خیالات، ماحول، مزاج اور افتادِ طبع کی بنیاد پر اردو ادب کا ایک اہم ستون قرار دیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنے اس مضمون میں سرسید کا تقابل فارسی کے بڑے نثر نگاروں، انشاء پردازوں اور شاعروں سے کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سرسید کو دقیق سے دقیق خیالات کے بیان پر دسترس حاصل تھی۔ اپنے اس مضمون میں شبلی نے سرسید کی علمی نثر سے مثالیں پیش کر کے انھیں ہر طرح کے خیالات کو اردو زبان میں بہت سہل انداز میں ادا کرنے والا سب سے بڑا ادیب بتایا ہے۔ عربی جیسی بڑی زبان پر کیے گئے مستشرقین کے اعتراضات کا حوالہ دیتے ہوئے اور ان کا دندان شکن جواب دیتے ہوئے سرسید کو (اس وقت کی حد تک) اردو جیسی کم ترقی یافتہ زبان میں ہر طرح کے مسائل پر اظہار خیال کرنے والا بڑا قلم کار بتایا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد شبلی نے اپنے معاصر، رفیق اور مشہور ناقد و شاعر مولانا الطاف حسین حالؔی کو سرسید کے سوانح نگار اور شارح کی حیثیت سے نہ صرف قائم کیا ہے بلکہ خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **10-10** سطروں میں دیجیے:

1. شبلی نعمانی کے مختصر سوانحی حالات لکھئے۔

2. شبلی نعمانی کی تحریروں کے امتیازات مختصراً لکھئے۔

3. شبلی نعمانی کی کتابوں کے بارے میں دس جملے لکھئے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. شبلی نعمانی کی حیات کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی نثر کی خصوصیات لکھئے۔

2. شبلی نعمانی کی ادبی اہمیت بیان کرتے ہوئے اُن کے مضمون ''سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

5.9 فرہنگ

حرف شناسی	حرف پہچاننا
صدر مدرس	پرنسپل
اسما	نام
سیاحت	سیر
معاصرین	اپنے زمانے کے لوگ
تنوع	طرح طرح کے
فقیہ	فقہ (مذہبی علم) کا جاننے والا
دلآویز	دل کو اچھا لگنے والا
صوتی	آواز سے متعلق
اسلوب	طریقہ
محاکات	کہانی کہنا (ایسے الفاظ استعمال کرنا جن سے پوری کہانی بیان ہو جائے)
اجرا	جاری کرنا
دقیق	مشکل
سوز	جلن
تردد	شک، فکر

بے جا	بلاوجہ
شارح	مطلب بتانے والا، تشریح کرنے والا

5.10 معاون کتابیں

1. شبلی — ظفر احمد صدیقی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
2. فکر ونظر (شبلی نمبر) — مدید شہریار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
3. شبلی معاصرین کی نظر میں — عبدالطیف اعظمی، نئی دہلی

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. شبلی نعمانی 1857ء میں پیدا ہوئے۔
2. شبلی نعمانی کی تاریخ وفات 18 نومبر 1914ء ہے۔
3. شبلی نعمانی ندوۃ العلماء میں معتمد تعلیمات تھے۔
4. شبلی حیدرآباد میں 1896ء سے 1905ء تک رہے۔
5. شبلی کی تین کتابوں کے نام سیرت النبیؐ، الفاروق اور المامون ہیں۔
6. شبلی کے معاصر نثر نگاروں میں سرسید، حالؔی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد شامل ہیں۔
7. شبلی مقالہ نگاری میں محاکات، بلاغت اور صوتی و معنوی مناسبتوں کا خیال رکھتے ہیں۔
8. مقالات شبلی کے آٹھ حصّے ہیں جن کے موضوعات مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی، فلسفیانہ اور قومی اور اخباری ہیں۔
9. شبلی کی نثر میں محاکات کی خاص اہمیت ہے جب وہ کسی واقعے جذبے یا حالت کی تصویر کشی کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی نثر خاص طور پر دلآویز ہو جاتی ہے۔ المامون، الفاروق اور سیرت النبیؐ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

اکائی 13: عبدالحق: ''حالی''

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 خاکہ نگاری کا فن

6.4 خاکہ کے اہم اجزا

6.4.1 اختصار 6.4.2 وحدت تاثر

6.4.3 کردار 6.4.4 اسلوب یا طرزِ نگارش

6.5 اردو میں خاکہ نگاری کی روایت

6.6 مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات اور ان کی خاکہ نگاری

6.7 مولوی عبدالحق کا خاکہ ''حالی'' کا متن (اقتباس)

6.8 ''حالی'' کا خلاصہ

6.8.1 حالؔی پر مولوی عبدالحق کے خاکے کے اہم نکات

6.9 خلاصہ

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.11 فرہنگ

6.12 معاون کتابیں

6.13 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کی اہم خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔ چونکہ خاکہ نگاری اُردو کی ایک باضابطہ صنف ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے خاکہ نگاری کے فن اور اس کی روایت کے بارے میں بھی جان لیں۔ لہٰذا اس اکائی میں خاکہ نگاری کے فن کے ساتھ ساتھ اس کی روایت سے متعلق مختصراً معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس کے بعد مولانا حالؔی پر مولوی عبدالحق نے جو خاکہ تحریر کیا ہے اس سے متعلق خاص خاص باتیں کیا ہیں' اور اسے کس درجہ موثر انداز میں مولوی صاحب نے قلم بند کیا ہے' کا علم بھی آپ اس اکائی میں حاصل کریں گے۔ آپ کے مطالعے کے لیے 'حالی' پر مولوی عبدالحق کے خاکے کے اصل متن کا اقتباس بھی اس اکائی میں شامل کیا گیا ہے۔

6.2 تمہید

اُردو کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔ اردو میں اس صنف کا آغاز کب اور کیسے ہوا اس کے بارے میں کوئی حتمی (آخری) رائے قائم نہیں کی جاسکی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی ابتدا سرسید اور ان کے رفقانے کی۔ بعد میں یہ صنف اردو میں پروان چڑھی اور آج اس کی ایک اچھی خاصی روایت موجود ہے اور یہ صنف روز افزوں ترقی پر ہے۔

6.3 خاکہ نگاری کا فن

اُردو لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ Sketch کا مترادف ومتبادل ہے۔ جس کا انگریزی مفہوم یہ ہے:

"A Rough Drawing and Painting"

اُردو میں اس کا لغوی مفہوم ''ڈھانچہ یا تصویر کا مسودہ'' ہے۔ اصطلاحی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادب کی ایک صنف ہے جس میں کسی شئے یا شخص کی زندگی کے نشیب وفراز کو موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ بھی ایسے شخص یا شخصیت کی

زندگی کے سفید وسیاہ کو نمایاں کیا جاتا ہے جس سے خاکہ نگار کے گہرے مراسم رہے ہوں یا شب وروز کا ساتھ رہا ہو۔

لفظ خاکہ کی جگہ اردو میں کچھ اور الفاظ بھی استعمال میں رہے ہیں۔ جیسے (1) مرقع (2) قلمی تصویر (3) شخصی مرقع یا شخصی تصویر وغیرہ۔ ان سب کا مفہوم عام طور سے ایک ہی ہے۔ جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے کہ اس میں کسی شخص کی مکمل تصویر یا اس کی زندگی کا مکمل عکس پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی شخصیت کے نمایاں اوصاف (محاسن و معائب۔ خوبیاں خرابیاں) کو جس سے اس کی شخصیت ابھرتی اور نمایاں ہوتی ہے' پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی خاکہ کسی شخصیت کا مکمل آئینہ نہیں ہوتا لہذا اس میں تفصیل کی بجائے اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ بلکہ یہاں خاکہ نگار ان کوائف وحالات کو ہی نمایاں کرتا ہے جس سے شخصیت کی ایک چلتی پھرتی اور زندہ تصویر ہمارے سامنے آجائے۔

6.4 خاکہ کے اہم اجزا

کسی خاکے کے حسب ذیل اجزا ہوتے ہیں:

(1) اختصار (2) وحدتِ تاثر

(3) کردار (4) اسلوب یا طرز نگارش

6.4.1 اختصار

کسی بھی خاکہ کے لیے اختصار کا ہونا لازمی ہے۔ اختصار سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے بیان میں لفاظی اور طول بیانی سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ کسی شخص کے اوصاف ومعائب (خرابی' خامی) کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں اختصار بھی ہو' جامعیت بھی اور اثر بھی۔ یہ اختصار اس لیے بھی لازمی ہے کہ قاری کسی خاکہ کو ایک ہی نشست میں پڑھ سکے۔

6.4.2 وحدتِ تاثر

خاکہ میں وحدتِ تاثر کا ہونا افسانہ کی طرح ہی انتہائی ضروری ہے اور یہ وصف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب خاکہ میں اختصار سے کام لیا جائے۔ خاکہ نگار 'تاثر' پیدا کرنے کے لیے انتہائی مہارت سے خاکہ کی ابتدا کرتا ہے اور

واقعات کے سہارے وہ اسے وسط تک لے جاتا ہے اور پھر اس کا خاتمہ موثر انداز میں کرتا ہے۔ ابتدا' وسط اور خاتمہ کو واقعات و تجربات و مشاہدات کی مدد سے مربوط انداز میں پیش کرتا ہے جس سے وحدت تاثر کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

6.4.3 کردار

کردار کسی بھی خاکہ کے لیے ایک بنیادی عنصر ہے جس کے گرد خاکہ کی عمارت بڑے تزک و احتشام کے ساتھ تعمیر کی جاتی ہے۔ اس کے بغیر خاکہ کا تصور محال ہے۔ افسانوی ادب میں جس طرح کردار کی اہمیت ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح خاکہ میں بھی ہوتی ہے۔ ناول و افسانہ و ڈرامہ میں جس طرح مرکزی کردار ہوتے ہیں اسی طرح اس میں بھی ایک مرکزی کردار لازمی طور پر ہوتا ہے۔ دیگر اصناف میں چند ضمنی کردار بھی ہوتے ہیں لیکن یہاں ضمنی کرداروں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک آدھ کردار کی شمولیت محض اپنی بات کو پرزور بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خاکے اکثر یک کرداری ہوتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا اہم کردار ہوتا بھی ہے تو وہ راوی خود ہوتا ہے۔ دوسری اصناف میں کرداروں کی جو اہمیت بتائی گئی ہے وہ اس میں بھی بڑی حد تک لازمی ہے۔ یوں تو خاکہ میں کسی شخصیت کا محض سرسری اخلاق و اطوار بیان کر دینا بھی کافی ہوتا ہے لیکن ایک اچھے خاکہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے انسانی فطرت' انسانی نفسیات' جذبات و احساسات' عقائد و نظریات' پسند و ناپسندیدگی' عصبیت و کجروی' غرض یہ کہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں' کوتاہیوں کے حوالے سے بھی دیکھا اور دکھایا جائے۔ تب ہی کسی کردار یا شخصیت کا مطالعہ مکمل اور موثر سمجھا جائے گا۔ یہاں خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ بڑی حد تک معروضیت سے کام لے' کذب و افترا اور بہتان طرازی سے بچے اور حقیقی تجربات و مشاہدات اور واقعات کی روشنی ہی میں کردار کو نمایاں کرے کیوں کہ ایسا کرنے سے ہی کردار جاندار ہو کر ابھرے گا۔

6.4.4 اسلوب یا طرز نگارش

کسی خاکہ نگار کا اسلوب بھی کردار یا شخصیت کو سمجھنے اور اس کے نقش کو ابھارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کا اسی لیے زبان و ادب پر قدرت کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ خاکہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ

روزمرہ اور محاورے کے تخلیقی استعمال سے بخوبی واقف ہو، موثر زبان اور لطیف جملے اور فقرے گڑھنے اور تراشنے میں اسے مہارت حاصل ہو۔ شخصیت کی زندگی کے ''نشیب و فراز'' اور ''سفید و سیاہ'' کو نمایاں کرنے میں وہ ناصح اور پارٹی کا کردار ادا نہ کرے اور نہ ہی منفی تنقیدی رویے سے کام لے بلکہ وہ یہاں ناصح اور ناقد کے بجائے مزاح نگار (پھکڑ پن نہیں) کا رول ادا کرے اور اپنی بذلہ سنجی کو کام میں لائے۔ طنز کو تعریض نہ بننے دے اور نہ ہی طنز پھبتی بن کر ابھرے۔ بلکہ طنز بھی اس قدر شگفتہ اور شائستہ ہو کہ بے اختیار تبسم ہونٹوں پر کھل جائے۔ خرابی بھی خوبی معلوم ہو۔ خاکہ نگار کا بیان کسی واقعہ اور تجربہ کے حوالے سے ہمدردانہ ہونا چاہیے جارحانہ تو بالکل نہیں۔ کسی شخصیت کا خاکہ کھینچتے وقت اسے تضحیک اور تمسخر سے بھی بچنا چاہیے۔ خاکہ نگار کا طرز تخاطب اور اندازِ بیان اگر شگفتہ اور ہمدردانہ ہوگا تو لازمی طور پر اس شخص کا نقش گہرا ہو کر ابھرے گا اور اگر اس کے برعکس ہوگا تو نقش نہ تو نمایاں ہوگا اور نہ ہی اس میں جاذبیت ہوگی۔ کسی بھی خاکہ کی کامیابی و ناکامی کا انحصار خاکہ نگار کے اسلوب اور طرز نگارش پر ہی ہے۔ اس لیے یہ کسی خاکہ کا سب سے اہم عنصر ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. 'خاکہ' کس انگریزی لفظ کا متبادل ہے؟
2. اُردو میں خاکہ کے لیے اور کون سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں؟
3. خاکہ کے اہم اجزا کیا ہیں؟

6.5 اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت

اردو میں خاکہ نگاری کی شروعات کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا فی الحال ممکن نہیں۔ یوں تو خاکہ نثری صنف ہے۔ اس لیے اس کے ابتدائی نقوش نثری اصناف میں تلاش کرنا سودمند ہے۔ لیکن نثر سے قبل ہمارے یہاں شاعری کا چلن عام ہوا، جن میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی تین بڑی اہم اصناف ہیں اور ان تینوں اصناف میں شخصی خاکہ ملتے ہیں۔ خصوصاً قصیدہ اور مرثیہ اس سلسلے کی اہم اصناف ہیں۔ نثر میں ان کے نقوش تذکروں

میں موجود ہیں خواہ وہ ''نکات الشعراء'' (میر تقی میرؔ) ہو' ''گلشن بے خار'' (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) ہو' طبقات شعرائے ہند'' (مولوی کریم الدین) ہو یا ''آب حیات'' (محمد حسین آزادؔ) ہو' لیکن ان تذکروں میں ''آب حیات'' کو چھوڑ کر بیشتر شخصی خاکے نامکمل اور غیر موثر ہیں۔ کیوں کہ ان کے پیش نظر نہ تو خاکوں کی روایت تھی اور نہ ہی ارادتاً وہ خاکہ لکھ رہے تھے۔ بعد میں سرسید اور ان کے رفقا نے جو سوانح عمریاں لکھیں ان میں خاکہ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ سوانح عمریاں کسی بھی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی ہیں لہٰذا ان میں اختصار کے مقابلے میں طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ضروری اور غیر ضروری نقش یا بات کو نمایاں کیا گیا ہے جو خاکہ کے لیے ضروری نہیں ہے۔

جیسا کہ آپ کو بتایا کہ مذکورہ بالا اصحاب میں محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں جن چند شعراء کی یعنی انشاؔ' مصحفیؔ' اور ذوقؔ و غالبؔ کی قلمی تصاویر پیش کی ہیں وہ بہر حال اہم اور دلچسپ ہیں۔ ان کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اس میدان میں باضابطہ قدم آگے بڑھایا اور دلی کی مشہور و معروف ہستیوں کی منھ بولتی اور چلتی پھرتی تصویریں ''قلمی چہرے'' کے عنوان سے پیش کیں۔ خواجہ صاحب کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اور ''دلی کا یادگار مشاعرہ'' کے نام آتے ہیں۔ اس میدان میں مولوی عبدالحق کا نام بھی انتہائی قابل ذکر ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے 1937ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ذیل میں رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے مجموعے ''گنج ہائے گراں مایہ'' (1937ء) ''ہم نفسانِ رفتہ'' (1944ء) میں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب پر الگ سے انہوں نے ایک پر اثر خاکہ 1962ء میں قلم بند کیا تھا۔ ''آشفتہ بیانی میری'' ''مضامینِ رشید'' اور ''خنداں'' میں بھی چند دلچسپ خاکے ملتے ہیں۔

ان مذکورہ ادیبوں کے علاوہ جن دوسرے ادیبوں نے خاکوں کی مدد سے اردو ادب کو متمول بنانے کی کوشش کی ان میں سید عابد حسین (کیا خوب آدمی تھا)' مولوی عبدالرزاق کانپوری (یادایام)' فکر تونسوی (خدو خال)' عصمت چغتائی (دوزخی)' سعادت حسن منٹو (گنجے فرشتے' لاؤڈ اسپیکر' شخصیتیں)' اشرف صبوحی دہلوی (دلی کی چند

عجیب ہستیاں)، شوکت تھانوی (شیش محل، قاعدے بے قاعدہ)، ڈاکٹر اعجاز حسین (ملک ادب کے شہزادے)، شاہد احمد دہلوی (گنجینۂ گوہر)، محمد طفیل مدیر نقوش (صاحب جناب، محترم، مکرم، آپ)، رئیس احمد جعفری (مردم دیدہ)، چراغِ حسن حسرت (مداوا، ناروا خون بہا)، غلام احمد فرقت (حسرت موہانی)، عبدالمجید سالک (یارانِ کہن)، مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ)، مظہر امام (اکثر یاد آتے ہیں)، انور ظہیر خاں (مت سہل ہمیں جانو)، کشمیری لال ذاکر (آشنا چہرے)، امداد اللہ ندوی (انجمن کے چند روشن چراغ)، ندا فاضلی (چہرے)، خالد محمود (شگفتگی دل کی) وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو مذکورہ بالا ادیبوں نے استحکام بخشا ہے اور اسے خاصے کی چیز اور قابل مطالعہ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. اُردو کے چند اہم خاکہ نگار اور اُن کے نمائندہ خاکوں کی نشاندہی کیجیے۔
5. ''چند ہم عصر'' کس کے خاکوں کا مجموعہ ہے اور یہ کب شائع ہوا؟
6. رشید احمد صدیقی کی چار کتابوں کے نام بتایئے۔

6.6 مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات اور ان کی خاکہ نگاری

مولوی عبدالحق کا نام اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں نہایت نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان و ادب کو متمول بنانے، اسے ترقی دینے اور اسے تحفظ فراہم کرنے اور کرانے کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے ان ہی خطوط پر کام کرتے رہے۔

مولوی صاحب کا سب سے نمایاں کام تاریخ ادب کے قدیم اثاثے کو محفوظ کرنے اور اسے مستند انداز اور جدید املا کے مطابق پیش کرنا ہے۔ انہیں کی کوششوں سے ہمارا قدیم کلاسیکی ادب بڑی حد تک محفوظ ہو سکا یا اسے محفوظ کرنے کا رجحان بڑھا۔ اگر انہوں نے تحقیق و تدوین کے فرائض انجام نہ دیے ہوتے اور انہیں اشاعت کے مرحلے سے نہ گزارا ہوتا تو شاید ہمارا قدیم اثاثہ اس طرح زمانہ کی گردش سے محفوظ نہ رہ پاتا۔ ''سب رس''، ''قطب مشتری''

اور ''رانی کیتکی کی کہانی'' وغیرہ کی تلاش وتحقیق انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ان کے علاوہ انہوں نے قدیم شعراء کے دواوین بھی شائع کیے۔ چند اہم شعراء کے کلام کا انتخاب شائع کر کے انہیں عام ہاتھوں تک پہنچایا اور قواعد اردو انگریزی لغت کی تیاری کی طرف بھی مولوی صاحب نے دھیان دیا اور کتابیں شائع کیں۔ ان تمام تصنیفی وتالیفی کاموں کے علاوہ مولوی صاحب نے ادارہ سازی کا کام بھی کیا۔انجمن ترقی اردو ہندو پاک انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔مولوی صاحب نے صحافت کی دنیا میں بھی قدم رکھا اور نمایاں خدمات انجام دیے۔تنقید کے میدان میں بھی آپ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔آپ کے تنقیدی مضامین، تبصرے اور مقدمے اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

مولوی عبدالحق نے جملہ ادبی، تحقیقی وتنقیدی خدمات کے علاوہ خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا نقش دوام قائم کیا اور آج آپ ایک کامیاب خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔آپ نے ایک ایسے وقت میں جب کہ اردو میں خاکہ نگاری کا فن نہ تو ترقی یافتہ تھا اور نہ ہی اس کی رفتار تسلی بخش تھی اس صنف پر توجہ فرمائی اور اسے اپنی نگارش سے مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

آپ کے خاکوں کا مشہور مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے 1937ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں 24 شخصیات پر لکھے خاکے موجود ہیں۔آپ نے یہ خاکے عام طور سے بڑی شخصیات کے انتقال فرمانے کے بعد لکھے۔

مولوی صاحب نے جن بڑی شخصیتوں کا خاکہ کھینچا ہے وہ عموماً اپنے میدان میں بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور مولوی صاحب کے مراسم ان میں سے اکثر سے عقیدت مندانہ اور گہرے رہے ہیں۔انہوں نے نہ تو ان خاکوں میں ممدوح کی بے جا تعریف وتوصیف بیان کی ہے اور نہ ہی لعن وطعن سے کام لیا ہے بلکہ بڑی حقیقت پسندانہ انداز میں شخصیت کے مرقع پیش کیے ہیں۔وہ کسی شخصیت کی خوبیاں یا خامیاں بیان کرتے وقت اعتدال سے کام لیتے ہیں نہ تو وہ خوبیاں بیان کرتے وقت زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور نہ ہی برائیوں کا ذکر کرتے وقت بے جا طنز و تعریض کا انداز اختیار کرتے ہیں۔نہ ہی زبان چٹخارے دار بناتے ہیں اور نہ ہی دوستی اور مراسم کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی شخصیت کے مقام ومرتبہ سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ان کے پیش نظر ہمیشہ شخصیت کی سچی اور مکمل انسانی تصویر ہوتی ہے اور جسے وہ انتہائی سادہ زبان اور غیر مقفیٰ عبارت میں رقم کرتے ہیں۔ان کی نثر میں اس خوبی کی

وجہ سے سلاست اور روانی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا بے ساختہ پن ان کی نثر کو موثر بناتا ہے۔ ان کے خاکے ادھورے اور نامکمل نہیں ہوتے۔ نہ ہی وہ کسی شخصیت کی آدھی تصویر ابھارتے ہیں بلکہ ان کے قلم سے بنائی گئی لفظی اور قلمی تصویریں مکمل اور جاذب ہوتی ہیں۔ ان کے خاکوں کا اصلی وصف جامعیت ہی ہے۔

ان کے خاکوں کا مجموعہ 1937ء میں منظر عام پر آیا تھا یعنی یہ خاکے 1937ء کے آس پاس یا قبل تحریر کیے گئے تھے لیکن باوجود اس کے ان کی زبان شبلی کی طرح رنگین اور مولانا ابوالکلام کی طرح معرب اور مفرس نہیں بلکہ سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ مولوی صاحب اپنے خاکوں میں اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے اور نہ ہی زبان دانی کا مظاہرہ ان کا مقصد رہا ہے۔ بلکہ وہ تو شخصیتوں کی تصویر کو زندہ اور متحرک بنانے کے لیے حسب حال سادہ الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہیں اور دلچسپ اور موثر مرقع تراشتے ہیں۔ روزمرہ اور محاورے سے ٹھیک اسی طرح کام لیتے ہیں جس طرح میر امن نے لیا تھا۔ محاوروں کے استعمال میں نذیر احمد کے بجائے میر امن کے مقلد نظر آتے ہیں۔ نامانوس اور مشکل الفاظ سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں شعری زبان اور شعری لوازمات (تشبیہ، استعارے) وغیرہ کا استعمال کم سے کم کیا ہے اور اگر کہیں کیا ہے تو اس سے ان کی نثر میں ایک طرح کی جاذبیت اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کے خاکے کامیاب، موثر اور دلچسپ ہیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں سے شخصیتوں کے پوشیدہ گوشے نہ صرف روشن ہوئے ہیں بلکہ انہیں سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ ان کے خاکوں کی مدد سے شخصیتوں کے اخلاق و آداب، اطوار و کردار، نفسیات و رجحانات، عقائد و نظریات کو سمجھنے اور جاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان خاکوں کی مدد سے شخصیات کی داخلی و خارجی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں اور کوئی بھی شخصیت تمام و کمال انداز میں ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو مولوی عبدالحق کے خاکوں میں، بالخصوص ''حالی'' میں پائی جاتی ہے اور اس طرح یہ ان کا کامیاب خاکہ ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. مولوی عبدالحق کی نثر کی خوبی کیا ہے؟

8. کیا مولوی صاحب اپنے خاکوں میں مقفیٰ، معرب یا مفرس زبان استعمال کرتے ہیں؟

9. مولوی صاحب کے تحریر کردہ خاکوں کی خصوصیت کیا ہے؟

6.7 مولوی عبدالحق کا خاکہ ''حالی'' کا متن (اقتباس)

غالباً 1892ء یا 93ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اس زمانہ میں یونین کی پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا، اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ''حیات جاوید'' کی تالیف میں مصروف تھے۔ ان ہی دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا، تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں مہمان عزیز فرمانے لگے'' ملنے سے، اور باتوں سے، تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے ''مسدس'' لکھا ہے۔'' یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ .....ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا ملے۔ مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔ ''ہائے ظالم نے کیا کیا۔'' اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے'' یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔'' اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا، وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں، ایک سادگی اور دوسری دردِ دل، اور یہی شان اُن کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے نام ور اصحاب اور اپنی قوم کے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔ .....خاکساری اور فروتنی خلقی تھی.....ان کا رتبہ بڑا تھا۔ مگر انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے۔ لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔

اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں۔ ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا۔ کبھی ''مولفہ'' یا ''مصنفہ'' کا لفظ نہ لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انور احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھالیا۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کھانا منگوایا۔.....پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے۔ ان کے لیے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا۔ پھر ان کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر گرا دیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔.....مہمان کے آنے سے (اور اکثر ایسا ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا، اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔.....اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروت

ایسے تھا کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مند اُن کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم وملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے' تو انہیں بہت رنج وافسوس ہوتا تھا۔ تحریر وتقریر میں کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا' جو کسی فرقہ کی دل آزاری کا باعث ہو۔

نام ونمود چھو کر نہیں گیا تھا' ورنہ شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔.....

دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں' شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے' مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ مثلاً

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے

کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

اُن کا ذوق شعری اعلیٰ درجے کا تھا۔ جیسا کہ ''حیات سعدی'' ''یادگار غالب'' اور ''مقدمۂ شعر وشاعری'' سے ظاہر ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں' جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی' تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے .....اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔.....لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ ''میرا حافظہ بہت کمزور ہے اپنا لکھا یاد نہیں رہتا۔'' یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا' اس میں کچھ حقیقت بھی تھی' لیکن اصل بات یہ تھی کہ یہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں' ان کا ذکر نہیں' لیکن جو تحت اللفظ

پڑھتے ہیں' ان میں بعض طرح طرح سے چشم وابرو' ہاتھ' گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ ایک بار علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی جو بہت بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک ہی بند پڑھنے پائے تھا کہ مولانا سے نہ رہا گیا۔ نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو خیر اس زمانہ میں موردِ لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس وناکس ان پر منہ آتا تھا' لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالی تھے۔ ہر وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا' یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا' اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور ''مقدمۂ شعروشاعری'' نے خاصی آگ لگادی۔ اہل لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں۔ وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انہیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ یہ ساری کارروائی ان ہی کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا۔ ہر طرف نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔ ''اودھ پنچ'' میں ایک طویل سلسلۂ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکی اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کے عنوان ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولانا سب کچھ سہتے رہے' لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا ؎

کیا پوچھتے ہو؟ کیوں کر؟ سب نکتہ چیں ہوئے چپ

سب کچھ کہا انہوں نے' پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینیوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہ لوگ جو انہیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے' ان

کی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مولانا نے دنیوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں تھے۔ اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انہیں عربی اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انہوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے۔

غالباً سوائے اک آدھ کے انہوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی جس نے چاہا' چھاپ لی۔ ان کی تصنیفات مال غنیمہ تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔

مروت کے پتلے تھے.....اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔

.....اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابل اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب ''حیات جاوید'' شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لیے ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لیے جو اس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف' دیکھتے ہی فرمایا کہ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے''۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیے۔ قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں' مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون' مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی

خاں سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے' آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ''میں تنقید سے منع نہیں کرتا' تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی؟ لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا' منصب تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا حالی انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا' نہ ہوسکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم وتہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے' اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ اور یہ جو سمجھتے تھے' وہ کر کے دکھایا۔ آج سیکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں' جنہوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو۔..... تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انہوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا' جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اورینٹل لائبریری قائم کی' جو پانی پت سے سب سے بلند اور پرفضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی' جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے' انہوں نے ہمیشہ حمایت کی ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا' ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے' شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا' اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا' مگر وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے' خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔..... ان کی

بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجہ کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یوروپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا کہ وہ نمونے کا کام دیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں: ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی، جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔

6.8 ''حالی'' کا خلاصہ

مولوی عبدالحق نے حالی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کی زندگی کے چند اہم نمایاں ترین واقعات کا انتخاب اس طرح کیا ہے کہ حالی کی شخصیت ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے مزاج و طبیعت کی سادگی ان کی وسیع القلبی و وسیع النظری، انسان دوستی و انسانیت نوازی، تبحر علمی اور ناقدانہ بصیرت کا نہ صرف پتہ چلتا ہے بلکہ اس کا صحیح صحیح اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے حالی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی شروعات 93-1892ء سے بتائی ہے جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے اور یہ سلسلہ ان کی موت تک قائم رہا۔

مولوی صاحب مولانا حالی کی طبیعت کی سادگی کے قائل تھے باوجود اس کے کہ وہ ایک بڑے ادیب، شاعر اور نقاد تھے لیکن ان کے اندر کسی طرح کی رعونت اور فخر کا شائبہ موجود نہیں تھا۔ وہ دوسروں کو دکھ درد میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے 1905ء کا علی گڑھ کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے جس میں ایک رئیس نے تانگے والے پر بے جا ظلم روا رکھا۔ مولانا کا مزاج اس منظر کو دیکھ کر مکدر (میلا) ہو گیا اور وہ سارا دن اظہار افسوس کرتے رہے۔

مولوی عبدالحق نے اسی لیے مولانا کی شخصیت کے دو اہم عناصر یعنی دردمندی اور سادگی کی بڑی تعریف کی ہے۔ مولوی صاحب نے بحیثیت انسان انہیں اپنے رفقا اور مربیوں بالخصوص سرسید سے بہتر انسان قرار دیا ہے۔ ان کی فطرت میں خاکساری اور خوش خلقی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ اپنی بڑائی کا رعب نہیں ڈالتے تھے اور نہ ہی چھوٹوں کو حقیر

جانتے تھے۔ بلکہ چھوٹوں پر وہ بے نیاز شفقت کرتے اور ان کی ہمت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے مولوی حمید الدین سے ملاقات کا ایک اہم واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اس خاکساری کی عمدہ مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیشتر تصنیفات کو تالیفات لکھا ہے۔

مولانا کی ایک اہم خوبی ان کی مہمان نوازی بھی تھی۔ وہ خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے اور مہمان کی آمد پر رنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔

مولانا کی آمدنی اگرچہ قلیل تھی لیکن دوسروں کو وہ کبھی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی سے وہ خوش ہوتے تھے ان کے لیے سفارش کرتے۔ مولانا بے تعصب آدمی تھے۔ چھوٹے بڑے اور ہندو مسلم میں وہ فرق نہیں کرتے تھے بلکہ سب سے یکساں محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم نزاع کو انہوں نے کبھی بھی پسند نہیں کیا۔

مولانا خودستائی اور خود آرائی میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان کے انکسار کا عالم یہ تھا کہ وہ خود کو ہمیشہ چھپاتے تھے۔ بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں حافظہ کی کمزوری کا بہانہ کر کے اپنے اشعار سنانے سے معذرت کر لیتے تھے۔ مولوی صاحب نے اس سلسلے میں دو واقعات موثر انداز میں بیان کیے ہیں۔

مولانا حالی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اعتراضات پر چاہے وہ بے جا ہی کیوں نہ ہو، کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے اور اکثر اسے ٹال جاتے تھے۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی اشاعت کے بعد اہل لکھنؤ نے سخت اعتراضات کیے اور لعنت ملامت سے کام لیا اور یہاں تک لکھا کہ:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولانا اس طرح کی واہیات و خرافات سے رنجیدہ تو ضرور ہوتے تھے لیکن خاموش رہتے اور تہذیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ مولانا اس میں یقین رکھتے تھے کہ زمانہ ان کا ایک دن اعتراف ضرور کرے گا اور بقول

حالی یہی ہوا بھی ع غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مولانا کے کردار کی ایک اہم صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ مولانا جاہ و منصب کے بھوکے نہیں تھے اور نہ ہی دولت ان کی کمزوری تھی بلکہ صبر و شکر اور قناعت کے وہ قائل تھے اور کم پر بسر کرنے کا سلیقہ انہوں نے سیکھ لیا تھا۔ کتابوں کی رائلٹی جو ان کا حق تھا لیکن اس کے بھی وہ کبھی خواہاں نہیں رہے۔ ان کی کتابوں کو چھاپ کر لوگوں نے لاکھوں کمایا لیکن انہوں نے اس کی کبھی شکایت نہیں کی بلکہ مولانا اس پر دھیان بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کا مقصد زبان و ادب کی خدمت اور اس کی ترویج و اشاعت تھا اور تا حیات انہوں نے یہی کیا۔

مولانا حیا و مروت کے پتلے تھے۔ دل جوئی ان کا وطیرہ تھا' کسی کی دل آزاری کی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ طلباء کی ہمت افزائی میں مولانا کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ کسی ہونہار نوجوان کو دیکھتے تو خوش ہوتے اور اس کی تحریر کی داد دیتے اور اگر کوئی قابل اصلاح بات ہوتی تو بڑی نرمی اور شفقت سے اسے سمجھاتے۔ ''حیات جاوید'' کی اشاعت پر اسے کذب و افترا کا آئینہ کہا گیا لیکن مولانا کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔

مولانا انگریزی سے واقف نہ تھے باوجود اس کے عصری ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ قوم و ملت کی ترقی میں یقین رکھتے تھے۔ اپنی کوششوں سے انہوں نے ایک اسکول اور ایک لائبریری قائم کی تھی۔

مولانا مزدوروں' بے کسوں اور عورتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مولانا کی سادگی کو لوگوں نے روکھے پن سے تعبیر کیا جب کہ مولانا بذلہ سنج بھی تھے اور شگفتہ مزاج بھی' بے تکلف دوستوں میں ان کی یہ خوبی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ صرف روتے بسورتے نہیں تھے بلکہ وہ دردمند دل کے مالک تھے اور ان کی شاعری میں طنز و ظرافت کے عناصر بہت موجود ہیں۔

مولانا جدید ذہن کے مالک ہی نہیں تھے بلکہ عوام الناس میں جدید تعلیم کو عام کرنا بھی چاہتے تھے۔ اردو ادب کے دامن میں جدید مغربی اصناف کی مدد سے وسعت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ خصوصاً وہ ناول اور ڈرامے کو اردو میں خاطر خواہ جگہ دینے کے قائل تھے تا کہ اردو کا دامن وسیع ہو۔ مولانا اردو میں تذکیر و تانیث کے بے اعتدالیوں اور

جھگڑوں سے بھی پریشان رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس سلسلے سے اصول وقواعد مرتب ہو جائیں تا کہ بے راہ روی دور ہو۔

اس طرح مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کی زندگی' ان کے مزاج واطوار نظریات وخیالات' عقائد واخلاق' مروت ودردمندی کو بہت موثر اور مدلل انداز میں اس خاکہ میں پیش کیا ہے۔ مولوی صاحب کا حالی پر یہ خاکہ مکمل بھی ہے اور موثر ودلچسپ بھی۔

6.8.1 حالؔی پر مولوی عبدالحق کے خاکے کے اہم نکات

1. مولانا حالی سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔
2. انسان دوستی اور انسانیت نوازی ان کا شیوہ تھا۔
3. مہمانوں کی خاطر داری سے آپ خوش ہوتے تھے۔
4. بڑے شاعر' ادیب اور نقاد ہونے کے باوجود آپ کے اندر فخر کا شائبہ نہ تھا۔
5. آپ کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔
6. ناقدانہ بصیرت میں آپ اپنے ہم عصروں سے برتر تھے۔
7. ہمدردی اور دلجوئی کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔
8. کسی کو تکلیف میں دیکھ کر آپ تڑپ اٹھتے تھے۔
9. چھوٹے بڑے اور ہندو مسلم میں آپ فرق نہیں کرتے تھے۔
10. ہندو مسلم جھگڑے کو آپ نے کبھی پسند نہیں کیا۔
11. چھوٹوں سے بے پناہ ہمدردی اور شفقت سے پیش آتے تھے۔
12. انہوں نے اپنے معترضین کا جواب کبھی نہیں دیا بلکہ اسے ٹال جاتے تھے۔
13. مولانا جاہ ومنصب کے بھوکے نہیں تھے۔

14. کم آمدنی کے باوجود آپ دوسروں کی مدد کرتے تھے۔

15. اردو زبان وادب کو کبھی کمائی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کی ترویج واشاعت کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔

16. اردو زبان وادب کو آپ مغربی زبان وادب کے معیار کے مطابق لانا چاہتے تھے۔

17. مزدوروں، کسانوں اور عورتوں سے ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتے تھے۔

18. مولانا روکھے پھیکے نہیں تھے بلکہ بے تکلف دوستوں میں ان کی بذلہ سنجی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. مولوی عبدالحق کے مطابق حالؔی کی شخصیت کے دو اہم عناصر کیا تھے؟

11. حالؔی کی تصنیف ''حیات جاوید'' کو ان کے ایک مخالف نے کیا نام دیا تھا؟

12. مولانا حالؔی کی انگریزی میں کیا لیاقت تھی؟

6.9 خلاصہ

اُردو کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔ اُردو لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ Sketch کا مترادف ومتبادل ہے۔ اس میں کسی شئے یا شخص کی زندگی کے نشیب وفراز کو موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ لفظ خاکہ کی جگہ اردو میں کچھ اور الفاظ بھی استعمال میں رہے ہیں۔ جیسے (1) مرقع (2) قلمی تصویر (3) شخصی مرقع یا شخصی تصویر وغیرہ۔ کسی خاکے کے اجزا (1) اختصار (2) وحدتِ تاثر (3) کردار اور (4) اسلوب یا طرز نگارش ہوتے ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کی شروعات کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا فی الحال ممکن نہیں۔ نثری صنف ہونے کی وجہ سے اس کے ابتدائی نقوش نثری اصناف میں ہی تلاش کرنا سودمند ہے۔ محمد حسین آزؔاد نے ''آبِ حیات'' میں انشؔا، مصحفؔی، اور ذوقؔ وغالبؔ کی جو قلمی تصاویر پیش کی ہیں وہ بہرحال اہم اور دلچسپ ہیں۔ ان کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اس میدان میں باضابطہ قدم آگے بڑھایا اور دلی کی مشہور ومعروف ہستیوں کی منھ بولتی اور چلتی

پھرتی تصویریں ''قلمی چہرے'' کے عنوان سے پیش کیں۔خواجہ صاحب کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں ''نذیر احمد کی کہانی کچھان کی کچھ میری زبانی'' اور ''دلی کا یادگار مشاعرہ'' کے نام آتے ہیں۔اس میدان میں مولوی عبدالحق کا نام بھی انتہائی قابل ذکر ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے 1937ء میں شائع ہوا تھا۔

مولوی عبدالحق نے حالی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کی شخصی خوبیوں کو مختلف واقعات کے حوالے سے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔حالی کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔خودستائی اور خود آرائی ان کا شیوہ نہیں تھا' نمود و نمائش کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ ہمدردی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔لوگوں کی دلجوئی میں وہ یقین رکھتے تھے۔

انہوں نے خود کو اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دیا تھا۔وہ ہر اعتبار سے اردو ادب کو ترقی یافتہ شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔اردو کو مغربی بالخصوص انگریزی زبان و ادب کے برابر کرنا ان کا خواب تھا۔ جدید سے جدید تر موضوعات اور اصناف سے اردو کے دامن کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔اس طرح حالؔی پر مولوی صاحب کا مذکورہ خاکہ انتہائی جامع اور موثر ہے۔

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **10-10** سطروں میں دیجیے:

1. خاکہ کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالیے۔
2. مولوی عبدالحق کی زبان کی خوبیاں بیان کیجیے۔
3. حالی کی شخصیت کے نمایاں اوصاف پر روشنی ڈالیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **30-30** سطروں میں دیجیے:

1. اردو میں خاکہ نگاری کی روایت پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
2. عبدالحق کا تعارف کراتے ہوئے 'حالی' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔
3. 'حالی' کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

6.11 فرہنگ

بورڈنگ ہاؤس	اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کے رہنے کا مکان
مغرب	پچھّم
تالیف	دو چیزوں کو باہم ملانا یا جمع کرنا
ترتیب	سلسلہ بندی، درجہ بدرجہ، یکجا کرنا
غفران مآب	بخشش والا (ایک خطاب)
مسدس	چھ ضلعوں کی شکل، نظم جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوں۔ یہاں مولانا کی طویل نظم مدوجزر اسلام کی طرف اشارہ ہے۔
بلدہ	شہر، نگر، بستی، قصبہ
فائز	فتح پانے والا، مقام پانے والا
سائس	گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے والا، کوچوان
متغیر	بدلا ہوا
کذب وافترا	جھوٹ و بہتان، جھوٹا الزام

6.12 معاون کتابیں

1. دیدہ ودریافت — نثار احمد فاروقی (مضمون 'خاکہ نگاری')
2. آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ نگاری — شمیم حنفی
3. اردو ادب کی مختصر تاریخ — انور سدید

6.13 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. Sketch

2. مرقع، قلمی تصویر، شخصی مرقع وغیرہ

3. اختصار، وحدت تاثر، کردار اور اسلوب یا طرز نگاری

4. مولوی عبدالحق کا خاکہ حالی، مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی، منٹو کا خاکہ گنجے فرشتے، عصمت چغتائی کا خاکہ دوزخی

5. ''چند ہم عصر''، مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو 1937ء میں شائع ہوا۔

6. گنج ہائے گرانمایہ، ہم نفسانِ رفتہ، آشفتہ بیانی میری اور خنداں

7. سلاست و روانی

8. نہیں

9. اُن میں بے جا تعریف، لعن طعن یا مبالغہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اعتدال سے کام لیا جاتا ہے۔

10. دردمندی اور سادگی

11. کذب و افترا کا آئینہ

12. مولانا حالی انگریزی نہیں جانتے تھے۔